# نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ



تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی

للت نارائن متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

۲۰۱۰ء

نگراں

**ڈاکٹر برکت علی**

ایم اے (ڈبل) پی ایچ ڈی (پی یو)

صدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج

ضلع: دربھنگہ (بہار)

ریسرچ اسکالر

**محمد فہیم ربانی**

موضع: محی الدین پورپکری

ضلع: دربھنگہ (بہار)

Phone No. 248014

Dr. Barkat Ali

B.A. Urdu (Hons.)
M.A. Urdu (P.U.)
M.A. Persian (P.U.)
Ph.D.(P.U.) H.O.D. Urdu.
M.L.S.M. College.
Darbhanga, Bihar.

باسمہ تعالیٰ

ڈاکٹر برکت علی

بی۔اے۔آنرز
ایم۔اے۔اردو (پی۔یو)
ایم۔اے۔فارسی (پی۔یو)
پی۔ایچ۔ڈی (پی۔یو)
صدر شعبۂ اردو
ایم۔ایل۔ایس۔ایم کالج
دربھنگہ۔بہار

Dated : 18 : XI : 2010

**L.N. MITHILA UNIVERSITY**
**Kameshwaranagar, Darbhanga**

This is to certify that **Md. Fahim Rabbani** worked under my supervision and guidance for the requisite number of terms and that his thesis entitled "**A study of Nazir Akbarabadi's Historical Nazms**", embodies his own contribution.

(3084)

Barkat Ali
(Dr. Barkat Ali)
H.O.D. (Urdu)
M.L.S.M. College
Darbhanga
L.N.M.U., Darbhanga

Dr. Barkat Ali
Head, Dept. of Urdu
M. L. S. M. College
Darbhanga

# نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ



تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی

للت نارائن متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

۲۰۱۰ء

نگراں

**ڈاکٹر برکت علی**

ایم اے (ڈبل) پی ایچ ڈی (پی یو)

صدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج

ضلع: دربھنگہ (بہار)

ریسرچ اسکالر

**محمد فہیم ربانی**

موضع: محی الدین پور پکری

ضلع: دربھنگہ (بہار)

L. N. Mithila University

# نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کاایک مطالعہ

Ph.D Thesis

نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ

L. N. Mithila University

# نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ

تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی

للت نارائن متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

۲۰۱۰ء


نگراں

**ڈاکٹر برکت علی**

ایم اے (ڈبل) پی ایچ ڈی (پی یو)

صدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج

ضلع: دربھنگہ (بہار)

ریسرچ اسکالر

**محمد فہیم ربانی**

موضع: محی الدین پورپکری

ضلع: دربھنگہ (بہار)


Ph.D Thesis


نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ

# فہرست

# فہرست



000

# تمہید

میں ادب میں ابتدا سے رجائی نظریات کا قائل رہا ہوں۔ میرا نقطۂ نظر رہا ہے کہ میدان ادب میں جب بھی کوئی قدم اٹھایا جائے تو وہ ''اگلا پاؤں نئے پانی میں'' کے مترادف ہو۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے کارواں میں شعروادب کا سلسلہ بھی دراز سے دراز تر ہے۔ اس میدان میں بھی ہر فرد نئے موسم اور نئے ماحول کا متلاشی نظر آتا ہے۔ ادب میں تحقیق وتدوین کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر محقق اپنے طور پر نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے —— چنانچہ ایم اے کرنے کے بعد جب میں تحقیق کی طرف متوجہ ہوا تو میری یہ خواہش رہی کہ کسی ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جو اہم بھی ہو اور اچھوتا بھی۔ بہت غوروفکر کے بعد میری نگاہ نظیر اکبرآبادی پر گئی۔ یہ ہماری زبان کا البیلا شاعر ہے مگر یہ بھی اتفاق کہ عرصے تک ناقدوں کی ناقدری کا شکار رہا۔ اہل ادب کے ذریعہ نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے

کہ دھیرے دھیرے نظیر اکبرآبادی کی بازیافت کا سلسلہ پھر شروع ہو چکا ہے اور بڑے بڑے ناقدین کرام نے اس عظیم شاعر کی جانب توجہ فرمائی ہے۔

میں اپنا شمار ادب کے ایک نہایت معمولی طالب علم میں کرتا ہوں۔ اردو ادب سے بچپن سے والہانہ لگاؤ رہا ہے۔ ادب میں بھی شاعری بالخصوص نظم گوئی سے مجھے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے شاعروں کی نظموں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ مگر کسی نے نظیر کی طرح مجھے متاثر نہیں کیا۔ بالخصوص نظیر کی نظموں کی مقامی خصوصیات نیز ان کا تاریخی شعور ہمیشہ میرا دامن دل کھینچتے رہے ہیں۔ نظیر کے کلام کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر فیلن کا یہ خیال ہر طرح درست نظر آتا ہے کہ نظیر کا دیوان خاصا تصویروں کا دیوان ہے۔ جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، سیر و تفریح، رنج و غم اور دل و دماغ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مقامی رنگ کی عکاسی اور تاریخ وار نظموں کا انبار جس درجہ نظیر کے یہاں پایا جاتا ہے اس درجہ کسی دوسرے اردو کے شاعر کے یہاں نہیں۔ چنانچہ ذہن میں ہمیشہ یہ خیال آتا رہا کہ انشاءاللہ وقت نے اگر کبھی تحقیقی مقالہ لکھنے کی فرصت عنایت کی تو نظیر کی شاعری کے حوالے سے ہی یہ کام انجام دوں گا۔ یہ خیال ایک ترنگ کی طرح تھا جو بار بار ذہن میں کوندتا رہا۔ مگر اسے عملی صورت میں پیش کرنا اس ذہنی

ترنگ کی طرح آسان عمل نہیں تھا۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے متعلق اپنا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے کے لئے میں نے استاد محترم جناب ڈاکٹر برکت علی ،صدر شعبہ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ سے مشورہ کیا اوران کی زیر نگرانی ''نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ قلمبند کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو موصوف نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے متعلق اس نئے موضوع سے نہایت خوش ہوئے اور بلا تکلف مجھے اپنی نگرانی میں تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ Synopsis کی تیاری سے لے کر رجسٹریشن کی منزل تک وہ ہر قدم پر میری رہنمائی کرتے رہے اور نظیر شناسی سے متعلق کچھ مفید خیالات سے بھی مجھے آگاہ کیا۔ کچھ نئی معلومات بھی ان کی زبانی مجھے حاصل ہوئیں۔

میرا یہ مقالہ تمہید، اختتامیہ اور کتابیات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

تمہید

باب اول • نظیر اکبرآبادی کا عہد

باب دوم • نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی قسمیں

پیش نظر سطور تمہیدی کلمات ہیں۔ ان سطور میں مقالے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے کی دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

باب اول کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کا عہد'' ہے۔ اس باب میں نظیر اکبرآبادی اور ان کے عہد کے معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی منظرنامے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے عہد کے معاشرتی و معاشی نیز ثقافتی پس منظر کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ قارئین کرام کو نظیر اور اس کے عہد سے کما حقہ واقفیت حاصل ہو جائے اور نظیر شناسی کا باب مزید روشن ہو سکے۔

باب دوم کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی قسمیں'' ہے۔ نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں عوام دوستی اور انسانی ہمدردی کے موضوعات پیش ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض نظموں میں ہندوستانی لوک کلچر کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ بعض نظمیں وہ ہیں جن میں

فطرت کی متنوع تصویریں پیش کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ ایسی منظومات بھی جابجا دیکھنے کومل جاتی ہیں جن میں نظیر کا صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ایسی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی ، درویشی، سادگی اور رواداری ، امن اور شانتی کے جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور جزاو سزا کے نکتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظیر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ہندو کلچر اور معتقدات کی ترجمانی کی گئی ہے۔اپنی نظموں میں نظیران موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن میں پندونصیحت سے کام لیا گیا ہے۔ایسی نظموں میں خاص طور پر فکری اور فلسفیانہ رجحان نمایاں نظرآتا ہے۔اس طرح کہاجاسکتا ہے کہ باب دوم ایک بھرپور باب ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''نظیراکبرآبادی کی بعض نظموں کا پس منظر'' ہے۔اس باب میں نظیر کی اہم اور چنندہ نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔نظیر کی نظموں کے پس منظر کو جاننے کے لئے ان کے عہد اور ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔اسی مناسبت سے باب اول میں نظیر کے عہد اور ماحول پر ایک سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''تاریخی واقعات تک نظیر کی فنکارانہ رسائی'' ہے۔جیسا کہ عنوان

سے ہی ظاہر ہے اس باب میں نظیر کے تاریخی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کس طرح نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کو اجاگر کیا ہے اور کس انداز سے اپنے عہد میں جیتے ہوئے تاریخی واقعات تک فنکارانہ رسائی دکھائی ہے۔

آخر میں ''اختتامیہ'' یعنی خاتمہ کلام ہے۔ یہاں مندرجہ بالا چاروں ابواب کا نچوڑ یا ماحصل پیش کیا گیا ہے تاکہ ان چند صفحات کے مطالعہ سے کوئی بھی باذوق قاری پوری تحقیق کے مزاج ومعیار کا اندازہ لگا سکے۔

سب سے آخر میں ان کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کتابوں سے میں نے تحقیق کے دوران استفادہ کیا ہے۔ اس فہرست میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے مطالعے سے اس موضوع کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا۔

ناانصافی ہوگی اگر یہاں مزید چند امور کی طرف اشارہ نہ کروں۔ یہاں مجھے چند بزرگوں، استادوں، دوستوں اور عزیزوں کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ ان سبھوں کی دعاؤں، محبتوں اور عملی تعاون سے میں تحقیق کے مرحلے سے آسانی سے گزر سکا۔ اور آج یہ تحقیقی مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرسکا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہاں مجھے اپنے والدین کی یاد شدت سے آرہی ہے۔ مرحومین کی خدمت میں میں نذرانہ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی مثبت کوششوں اور صالح پرورش و پرداخت کے سبب میں تعلیم کی اعلیٰ منزلوں سے گزر سکا اور آج اس لائق ہو سکا کہ اپنا تحقیقی مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

میرے مقالے کے نگراں جناب ڈاکٹر برکت علی، صدر شعبہ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ کی محققانہ اورفنکارانہ نگاہیں میرے مقالے کی ترتیب و تدوین میں رہنما ہوئیں۔ان کی دوررس نگاہوں نے میرے اندر چھپے ہوئے علم کو ابھارنے کی کوشش کی۔ان کی مشفقانہ نگہداشت اور استادانہ نگاہ میری رہنمائی نہ کرتی تو شاید یہ مقالہ اس صورت میں آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ان کی خدمت میں نذرانہ خلوص پیش کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

تحقیق کے سلسلے میں مجھے اور شہروں کے علاوہ کئی بار پٹنہ شہر کا سفر بھی کرنا پڑا۔اس کا سب سے بڑا سبب یہاں کی خدابخش پبلک اورینٹل لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری ہے۔ان دونوں لائبریریوں کے ارباب حل وعقد نے کتابوں کی فراہمی میں میری ہر ممکن مدد کی۔اس کے لئے میں ان سبھوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں محترم عطا عابدی، اردو شعبہ قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ کا بھی ہر طرح ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے تحقیق کے دوران مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ انہوں نے نظیرا کبرآبادی کی شاعری سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور نظیر کی نظموں کے بعض نکات کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر مجتبیٰ احمد بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے بھی تحقیق کی راہ میں پیش آنے والے مسائل سے مجھے آگاہ کیا اور تحقیق کے نئے طریقہ کار کی طرف میری توجہ دلائی ہے۔ مجتبیٰ احمد صاحب خود بھی ایک اچھے فن کار ہیں۔ خصوصی طور پر ان کا تعلق انشائیہ نگاری سے ہے۔ ان کے منتخب انشائیوں کا مجموعہ ''دریچہ تبسم'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ انشائیہ نگاری کے علاوہ موصوف کو ترجمہ نگاری سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ آپ انگریزی کے استاد ہیں اور فی الحال ہندوستان سے باہر اپنے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف نے انگریزی کی چند مشہور نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان نظموں کا مجموعہ بھی گذشتہ دنوں شائع ہو چکا ہے۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مجتبیٰ احمد صاحب ہر طرح اسم بامسمیٰ ہیں۔

میرے دوستوں میں جناب عبدالحئی صاحب بھی شکریے کے مستحق ہیں۔ آپ کا تحقیقی

کام ابھی جاری ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ ہم دونوں دوست ایک ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں گے۔

تحقیق کے لئے مواد کی فراہمی کے دوران بار بار پٹنہ آمدورفت کا سلسلہ رہا۔اسی آمدو رفت کے دوران میری ملاقات اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محسن رضا رضوی سے بھی ہوئی۔موصوف کی ذاتی لائبریری میں بھی ہزاروں نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔انہوں نے مواد کی فراہمی میں اپنی لائبریری کے دروازے میرے لئے وا کر دئے۔ان کی مہربانیوں کے لئے میں ان کا بھی سپاس گزار ہوں۔

سب سے آخر میں مجھے اپنی اہلیہ رخسانہ جمیل کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ جنہوں نے تحقیق کے دوران تمام تر گھریلو ذمہ داریوں سے مجھے بہت حد تک دور رکھنے کی کوشش کی۔انہوں نے ساری گھریلو ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں تاکہ میں تحقیق کا کام یکسوئی اور تندہی کے ساتھ انجام دے سکوں اور ایسا ہی ہوا۔میں اپنی تحقیقی کاوشوں میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا ہوں۔ میں نے ’’کسی حد تک‘‘ اس لئے لکھا کہ تحقیق کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اتنا آسان کام نہیں تھا۔اس کا فیصلہ قارئین اور ناقدین کرام کریں گے۔

یہاں میں اپنی دونوں بیٹیوں ضوفشاں فہیم اور سوزین فہیم اور دونوں بیٹوں صحویز فہیم اور

شہر یار فہیم کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں دین و دنیا میں سرخروئی عطا کرے۔ یہ چاروں بچے ابھی چھوٹے ہیں اور تعلیم کی منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ تعلیم کے اعلیٰ درجات سے بہرہ ور ہوں اور اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔ یہی بچے اب مستقبل کی ضمانت ہیں اور توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں علم و ادب کی خدمات ہم لوگوں سے بہتر انجام دے سکیں گے۔ ان کے لئے بس یہی کہوں گا کہ:

یہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

محمد فہیم ربانی

موضع: محی الدین پور پکری

ضلع: دربھنگہ ۸۴۷۱۰۳

# فہرست



000

# تمہید

میں ادب میں ابتدا سے رجائی نظریات کا قائل رہا ہوں۔ میرا نقطۂ نظر رہا ہے کہ میدان ادب میں جب بھی کوئی قدم اٹھایا جائے تو وہ ''اگلا پاؤں نئے پانی میں'' کے مترادف ہو۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے کارواں میں شعر و ادب کا سلسلہ بھی دراز سے دراز تر ہے۔ اس میدان میں بھی ہر فرد نئے موسم اور نئے ماحول کا متلاشی نظر آتا ہے۔ ادب میں تحقیق و تدوین کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ہر محقق اپنے طور پر نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے —— چنانچہ ایم اے کرنے کے بعد جب میں تحقیق کی طرف متوجہ ہوا تو میری یہ خواہش رہی کہ کسی ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جو اہم بھی ہو اور اچھوتا بھی۔ بہت غور و فکر کے بعد میری نگاہ نظیر اکبر آبادی پر گئی۔ یہ ہماری زبان کا البیلا شاعر ہے مگر یہ بھی اتفاق کہ عرصے تک ناقدوں کی ناقدری کا شکار رہا۔ اہل ادب کے ذریعہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے

کہ دھیرے دھیرے نظیر اکبر آبادی کی بازیافت کا سلسلہ پھر شروع ہو چکا ہے اور بڑے بڑے ناقدین کرام نے اس عظیم شاعر کی جانب توجہ فرمائی ہے۔

میں اپنا شمار ادب کے ایک نہایت معمولی طالب علم میں کرتا ہوں۔اردو ادب سے بچپن سے والہانہ لگاؤ رہا ہے۔ادب میں بھی شاعری بالخصوص نظم گوئی سے مجھے ایک خاص تعلق رہا ہے۔میں نے بچپن سے لے کر آج تک نہ جانے کتنے شاعروں کی نظموں کا مطالعہ کیا ہوگا۔مگر کسی نے نظیر کی طرح مجھے متاثر نہیں کیا۔بالخصوص نظیر کی نظموں کی مقامی خصوصیات نیز ان کا تاریخی شعور ہمیشہ میرا دامن دل کھینچتے رہے ہیں۔نظیر کے کلام کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر فیلن کا یہ خیال ہر طرح درست نظر آتا ہے کہ نظیر کا دیوان خاصا تصویروں کا دیوان ہے۔جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، سیر و تفریح ،رنج و غم اور دل و دماغ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مقامی رنگ کی عکاسی اور تاریخ وار نظموں کا انبار جس درجہ نظیر کے یہاں پایا جاتا ہے اس درجہ کسی دوسرے اردو کے شاعر کے یہاں نہیں۔چنانچہ ذہن میں ہمیشہ یہ خیال آتا رہا کہ انشااللہ وقت نے اگر کبھی تحقیقی مقالہ لکھنے کی فرصت عنایت کی تو نظیر کی شاعری کے حوالے سے ہی یہ کام انجام دوں گا۔یہ خیال ایک ترنگ کی طرح تھا جو بار بار ذہن میں کوندتا رہا۔مگر اسے عملی صورت میں پیش کرنا اس ذہنی

ترنگ کی طرح آسان عمل نہیں تھا۔

نظیرا کبرآبادی کی شاعری سے متعلق اپنا تحقیقی مقالہ سپردقلم کرنے کے لئے میں نے استادمحترم جناب ڈاکٹر برکت علی ،صدرشعبہ اردو،ایم ایل ایس ایم کالج ،دربھنگہ سے مشورہ کیا اوران کی زیرنگرانی ''نظیرا کبرآبادی کی تاریخی نظموں کاایک مطالعہ'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ قلمبند کرنے کی خواہش کا اظہار کیاتو موصوف نظیرا کبرآبادی کی شاعری سے متعلق اس نئے موضوع سے نہایت خوش ہوئے اور بلاتکلف مجھے اپنی نگرانی میں تحقیقی مقالہ سپردقلم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ Synopsis کی تیاری سے لے کر رجسٹریشن کی منزل تک وہ ہر قدم پرمیری رہنمائی کرتے رہے اورنظیر شناسی سے متعلق کچھ مفید خیالات سے بھی مجھے آگاہ کیا۔ کچھ نئی معلومات بھی ان کی زبانی مجھے حاصل ہوئیں۔

میرایہ مقالہ تمہید، اختتامیہ اور کتابیات کے علاوہ چارابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

تمہید

باب اول • نظیرا کبرآبادی کا عہد

باب دوم • نظیرا کبرآبادی کی نظموں کی قسمیں

پیش نظر سطور تمہیدی کلمات ہیں۔ ان سطور میں مقالے کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے کی دیگر تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

باب اول کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کا عہد'' ہے۔ اس باب میں نظیر اکبرآبادی اور ان کے عہد کے معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی منظرنامے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے عہد کے معاشرتی و معاشی نیز ثقافتی پس منظر کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ قارئین کرام کو نظیر اور اس کے عہد سے کما حقہ واقفیت حاصل ہو جائے اور نظیر شناسی کا باب مزید روشن ہو سکے۔

باب دوم کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی قسمیں'' ہے۔ نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں عوام دوستی اور انسانی ہمدردی کے موضوعات پیش ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض نظموں میں ہندوستانی لوک کلچر کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ بعض نظمیں وہ ہیں جن میں

فطرت کی متنوع تصویریں پیش کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ ایسی منظومات بھی جابجا دیکھنے کومل جاتی ہیں جن میں نظیر کا صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ایسی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی ، درویشی، سادگی اور رواداری ، امن اور شانتی کے جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور جزاو سزا کے نکتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظیر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ہندو کلچر اور معتقدات کی ترجمانی کی گئی ہے۔اپنی نظموں میں نظیر ان موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن میں پند و نصیحت سے کام لیا گیا ہے۔ایسی نظموں میں خاص طور پر فکری اور فلسفیانہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ باب دوم ایک بھر پور باب ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی بعض نظموں کا پس منظر'' ہے۔اس باب میں نظیر کی اہم اور چنندہ نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔نظیر کی نظموں کے پس منظر کو جاننے کے لئے ان کے عہد اور ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔اسی مناسبت سے باب اول میں نظیر کے عہد اور ماحول پر ایک سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''تاریخی واقعات تک نظیر کی فنکارانہ رسائی'' ہے۔جیسا کہ عنوان

سے ہی ظاہر ہے اس باب میں نظیر کے تاریخی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کس طرح نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کو اجاگر کیا ہے اور کس انداز سے اپنے عہد میں جیتے ہوئے تاریخی واقعات تک فنکارانہ رسائی دکھائی ہے۔

آخر میں ''اختتامیہ'' یعنی خاتمہ کلام ہے۔ یہاں مندرجہ بالا چاروں ابواب کا نچوڑ یا ماحصل پیش کیا گیا ہے تا کہ ان چند صفحات کے مطالعہ سے کوئی بھی باذوق قاری پوری تحقیق کے مزاج و معیار کا اندازہ لگا سکے۔

سب سے آخر میں ان کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کتابوں سے میں نے تحقیق کے دوران استفادہ کیا ہے۔ اس فہرست میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے مطالعے سے اس موضوع کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا۔

ناانصافی ہوگی اگر یہاں مزید چند امور کی طرف اشارہ نہ کروں۔ یہاں مجھے چند بزرگوں، استادوں، دوستوں اور عزیزوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان سبھوں کی دعاؤں، محبتوں اور عملی تعاون سے میں تحقیق کے مرحلے سے آسانی سے گزر سکا۔ اور آج یہ تحقیقی مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر سکا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہاں مجھے اپنے والدین کی یاد شدت سے آرہی ہے۔ مرحومین کی خدمت میں میں نذرانہ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی مثبت کوششوں اور صالح پرورش و پرداخت کے سبب میں تعلیم کی اعلیٰ منزلوں سے گزر سکا اور آج اس لائق ہوسکا کہ اپنا تحقیقی مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔

میرے مقالے کے نگراں جناب ڈاکٹر برکت علی، صدر شعبہ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج، دربھنگہ کی محققانہ اور فنکارانہ نگاہیں میرے مقالے کی ترتیب و تدوین میں رہنما ہوئیں۔ ان کی دوررس نگاہوں نے میرے اندر چھپے ہوئے علم کو ابھارنے کی کوشش کی۔ ان کی مشفقانہ نگہداشت اور استادانہ نگاہ میری رہنمائی نہ کرتی تو شاید یہ مقالہ اس صورت میں آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ ان کی خدمت میں نذرانہ خلوص پیش کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

تحقیق کے سلسلے میں مجھے اور شہروں کے علاوہ کئی بار پٹنہ شہر کا سفر بھی کرنا پڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہاں کی خدابخش پبلک اورینٹل لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری ہے۔ ان دونوں لائبریریوں کے ارباب حل وعقد نے کتابوں کی فراہمی میں میری ہر ممکن مدد کی۔ اس کے لئے میں ان سبھوں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

میں محترم عطا عابدی، اردو شعبہ قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ کا بھی ہر طرح ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے تحقیق کے دوران مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ انہوں نے نظیر اکبرآبادی کی شاعری سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور نظیر کی نظموں کے بعض نکات کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔

میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر مجتبیٰ احمد بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے بھی تحقیق کی راہ میں پیش آنے والے مسائل سے مجھے آگاہ کیا اور تحقیق کے نئے طریقہ کار کی طرف میری توجہ دلائی ہے۔ مجتبیٰ احمد صاحب خود بھی ایک اچھے فن کار ہیں۔ خصوصی طور پر ان کا تعلق انشائیہ نگاری سے ہے۔ ان کے منتخب انشائیوں کا مجموعہ ''دریچہ تبسم'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ انشائیہ نگاری کے علاوہ موصوف کو ترجمہ نگاری سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ آپ انگریزی کے استاد ہیں اور فی الحال ہندوستان سے باہر اپنے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف نے انگریزی کی چند مشہور نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان نظموں کا مجموعہ بھی گذشتہ دنوں شائع ہو چکا ہے۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مجتبیٰ احمد صاحب ہر طرح اسم با مسمّٰی ہیں۔

میرے دوستوں میں جناب عبدالحیٔ صاحب بھی شکریے کے مستحق ہیں۔ آپ کا تحقیقی

کام ابھی جاری ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ ہم دونوں دوست ایک ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کریں گے۔

تحقیق کے لئے مواد کی فراہمی کے دوران بار بار پٹنہ آمدورفت کا سلسلہ رہا۔اسی آمدو رفت کے دوران میری ملاقات اورینٹل کالج، پٹنہ سیٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر محسن رضا رضوی سے بھی ہوئی۔موصوف کی ذاتی لائبریری میں بھی ہزاروں نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں۔انہوں نے مواد کی فراہمی میں اپنی لائبریری کے دروازے میرے لئے وا کر دئے۔ان کی مہربانیوں کے لئے میں ان کا بھی سپاس گزار ہوں۔

سب سے آخر میں مجھے اپنی اہلیہ رخسانہ جمیل کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ جنہوں نے تحقیق کے دوران تمام تر گھریلو ذمہ داریوں سے مجھے بہت حد تک دور رکھنے کی کوشش کی۔انہوں نے ساری گھریلو ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں تاکہ میں تحقیق کا کام یکسوئی اور تندہی کے ساتھ انجام دے سکوں اور ایسا ہی ہوا۔میں اپنی تحقیقی کاوشوں میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے ''کسی حد تک'' اس لئے لکھا کہ تحقیق کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اتنا آسان کام نہیں تھا۔اس کا فیصلہ قارئین اور ناقدین کرام کریں گے۔

یہاں میں اپنی دونوں بیٹیوں ضوفشاں فہیم اور سوزین فہیم اور دونوں بیٹوں صحویز فہیم اور

شہریار فہیم کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں دین و دنیا میں سرخروئی عطا کرے۔ یہ چاروں بچے ابھی چھوٹے ہیں اور تعلیم کی منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ تعلیم کے اعلیٰ درجات سے بہرہ ور ہوں اور اپنے مستقبل کو سنوار سکیں۔ یہی بچے اب مستقبل کی ضمانت ہیں اور توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں علم و ادب کی خدمات ہم لوگوں سے بہتر انجام دے سکیں گے۔ ان کے لئے بس یہی کہوں گا کہ:

یہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

محمد فہیم ربانی

موضع: محی الدین پور پکری

ضلع: دربھنگہ ۸۴۷۱۰۳

# باب اول

# نظیر اکبرآبادی کا عہد

کیا ندرت آفریں یہ کلام نظیر ہے
ایک ایک نقطہ غیرت ماہ منیر ہے
نظموں میں زندگی پہ ہے تنقید کی مثال
دلکش کلام ، طرز بیاں دل پذیر ہے

(شفیق صدیقی جونپوری)

نظیر اکبر آبادی آسمان شعروادب کے تنہا ستارہ ہیں، جو اپنی شاعرانہ انفرادیت کے سبب عہد حاضر میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ نظیر تنہا ایک انجمن تھے، اپنے آپ میں ایک عہد تھے، اپنی ذات میں ایک دبستان تھے۔ ایک ایسا دبستان جس کے نظیر خود موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ نظیر کی شاعری میں ان کا عہد بہ ہر جہت نمایاں ہے۔ یعنی نظیر اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی بھی فن کار کے عہد کو سمجھنے کے لئے

سب سے پہلے اس کی شخصیت پر بھی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس کی شخصیت کے پس منظر میں ہی اس کی شاعری کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے نظیر کی شخصیت کے چند اہم گوشوں پر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز کو صف اول کا نظیر شناس تسلیم کیا جاتا ہے۔ نظیر شناسی یا نظیر دانی میں ان کی کتاب ''زندگانی بے نظیر'' کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر شہباز نے نہایت تفحص و تجسس، تلاش و تحقیق، غیر معمولی دلچسپی و عرق ریزی کے ساتھ نظیر کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ پروفیسر شہباز ان معنوں میں بھی خوش نصیب تھے کہ جب وہ اپنی گراں قدر تصنیف ''زندگانی بے نظیر'' قلم بند کر رہے تھے اس وقت نظیر کی نواسی ولایتی بیگم زندہ تھیں۔ شہباز نے ان سے براہ راست رابطہ حاصل کر کے نظیر کے سلسلے میں بعض حقائق جمع کئے۔ ولایتی بیگم کے علاوہ اس وقت آگرے میں چند بزرگان ایسے بھی تھے جنہوں نے نظیر کو دیکھا تھا۔ پروفیسر شہباز نے ان سبھوں سے براہ راست نظیر کے حالات معلوم کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''زندگانی بے نظیر'' کو نظیر شناسی کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ موصوف نے نظیر کی جوانی کی قلمی تصویر ان الفاظ میں اتاری ہے:-

''رنگ گندم گوں، قد متوسط، پیشانی بلند اور چوڑی آنکھیں چمک دار،

ناک بلند، داڑھی خشخشی ،موچھیں بڑی ،لباس وہی جومحمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں دہلی کے اندر رائج تھا۔یعنی کھڑکی دار پگڑی ، گاڑھے کا انگرکھا،سیدھا پردہ،نئ چولی اس کے نیچے کرتا،ایک برکا پاجامہ، گتھیلی جوتی ، ہاتھ میں شام دار چھڑی ،انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔''(۱)

یہ جوانی کا فوٹو ہے جو پروفیسر شہباز نے اپنے قلم سے اتارا ہے۔اب دیکھئے خود نظیر اپنے بڑھاپے کا حلیہ کس طرح شعری زبان میں بیان کرتے ہیں:

سست روش، پست قد ، سانولا ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پر اک خال تھا چھوٹا سا مسّے کے طور
تھا وہ پڑا آنکھ اور ابرو کے درمیاں

---

(۱)''زندگانی بے نظیر''مرتبہ:پروفیسر عبدالغفور شہباز اشاعت:۱۹۵۱ء،ص ۵

وضع سبک اس کی تھی پستہ نہ رکھتا تھا ریش

مونچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں

پیری میں تھی جس طرح اس کو دل افسردگی

ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں

نظیر کی پیدائش کے بیان میں اختلاف وقیاسات کو خاصا دخل ہے۔سید احتشام حسین کے مطابق:-

''نظیر کی پیدائش دلی میں ۱۷۴۰ء کے قریب ہوئی۔''(۱)

صغیر احمد جان نظیر کا سال ولادت ۱۷۴۰ء لکھتے ہیں۔(۲)

اس کے برعکس ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا خیال ہے کہ:-

''دل شکستہ محمد فاروق اور ان کی غمزدہ بیوی دونوں نہال ہو گئے۔انہیں فقیر کی دعا پر یقین آ گیا۔ خدا نے فقیر کی دعا قبول بھی کر لی اور

---

(۱)''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''،سید احتشام حسین

(۲)''تنویر ادب''،اشاعت:۱۹۸۰ء،ص۷۵

۱۱۴۷ہجری، مطابق ۱۷۳۷ء میں انہیں ایک اولاد عطا کی۔ باپ نے
اس کا نام ولی محمد رکھا۔"(۱)

اس باب میں جناب سلیم جعفر کا خیال ہے:-

"ولی محمد نظیر دہلی میں ۱۷۳۵ء میں مطابق ۱۱۴۷ہجری میں پیدا
ہوئے۔"(۲)

"کلیات نظیر اکبر آبادی" کے مرتب عبد الباری آسی اور "دیوان نظیر اکبر آبادی" کے مرتب مرزا فرحت اللہ بیگ بھی نظیر کا سال ولادت ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۵ء تسلیم کرتے ہیں۔ "تاریخ ادب اردو" جلد سوم اشاعت ۲۰۰۷ص، ۱۰۰۶ میں جمیل جالبی بھی یہی سال ولادت لکھتے ہیں۔ اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں پروفیسر وہاب اشرفی نہایت محتاط انداز میں لکھتے ہیں:-

"اب تک کی اطلاع کے مطابق نظیر اکبر آبادی دہلی میں ۱۷۳۵ء میں

---

(۱)"حرف ادب" شجاعت علی سندیلوی، اشاعت: ۱۹۷۸ء، ص ۵۷

(۲)"گلزار نظیر، سلیم جعفر، اشاعت: ۱۹۹۱ء، ص ب

پیدا ہوئے۔"(۱)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری (۲) اور ڈاکٹر سلیم اختر (۳) اپنی تاریخوں میں نظیر کا سال ولادت ۱۷۳۵ء تحریر فرماتے ہیں۔

نظیر کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ ان کو کوئی اولاد عرصہ تک نہ ہوئی۔ ان کی اہلیہ فقراء کے آستانوں پر دن رات حاضری دیا کرتی تھیں۔ اتفاق سے ایک دن ان کے دروازے پر ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا اور دعا کی طالب ہوئیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا:-

"پھولوں کا دونہ روزانہ ایک ہفتہ تک جمنا میں چھڑواؤ۔ خدا نے چاہا تو جیتا جاگتا بیٹا پاؤ گی اور اس بچے کی خوشبو سے دور دور مہک پھیلے گی۔"(۴)

---

(۱) "تاریخ ادب اردو"، وہاب اشرفی، اشاعت: ۲۰۰۷ء ص ۲۴۸

(۲) "اردو ادب کی تاریخ"، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اشاعت: ۲۰۰۶ء، ص ۵۷۰

(۳) "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"، ڈاکٹر سلیم اختر، اشاعت: ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۸

(۴) بحوالہ "کلیات نظیر اکبر آبادی" مرتبہ: عبدالباری آسی، اشاعت: ۱۹۵۱ء، ص ۳۲

اور ایسا ہی ہوا بزرگ کی دعا کام آگئی۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ''زندگانی بے نظیر'' میں لکھا ہے کہ نظیر کی پیدائش سے قبل محمد فاروق کی بارہ اولادیں انتقال کر چکی تھیں اور نظیر کا تیرہواں نمبر تھا، جو بہت سی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد زندہ بچے تھے۔ چنانچہ دوست احباب، رشتہ دار، عزیز و اقارب سب ان پر جی جان سے فدا تھے۔ ماں باپ نے نظر بد سے بچانے کے لئے نظیر کے کان ناک چھیدوا کر بالکل لڑکی جیسا بنا دیا تھا۔ اس سلسلے میں ''زندگانی بے نظیر'' کی اصل عبارت یوں ہے:-

> ''فقیر نے بشارت دی جا خوش ہو۔ ایک لڑکا تیرا ہوگا، زندہ رہے گا اور تیرے نام کو زندہ کرے گا، قابلیت اس کی غنچے کی طرح شگفتہ ہوگی اور خوشبو اس کی پھول کی طرح ہر جگہ پھیلے گی — نویں مہینے میاں نظیر دبستان عدم سے مکتب ظہور میں آئے، چونکہ کئی اولادوں کو مار کر ہوئے تھے اس لئے ناک کے ساتھ دونوں کان بھی چھید دئے گئے — ناک میں بلاق اور کانوں میں درلٹکا دئے گئے۔''(۱)

---

(۱) بحوالہ ''کلیات نظیر اکبرآبادی''، مرتبہ: عبدالباری آسی، اشاعت: ۱۹۵۱ء، ص ۳۳

نظیر کے مولد کے بارے میں بھی مختلف قسم کے بیانات پائے جاتے ہیں، جیسے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نظیر اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جنہوں نے عظیم آباد کو نظیر کا مولد قرار دیا ہے۔ عظیم آباد کو نظیر کا مولد قرار دینے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ نظیر کی پیدائش کے زمانے میں ان کے والد سید محمد فاروق عظیم آباد کے کسی نواب کے مصاحب تھے ـــــ لیکن بیشتر ناقدین، محققین اور مورخین کا خیال ہے کہ نظیر کا مولد دلی ہے اور یہی قابل اعتماد اور قرین قیاس بھی ہے۔ اس باب میں بھی بہت حد تک ہماری رہنمائی عبدالباری آسی کی مرتبہ کتاب ''کلیات نظیر اکبر آبادی'' سے ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے یہ عبارت :-

> ''بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر آگرے میں نہیں دلی میں پیدا ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغل امپائر کا ستارۂ اقبال زوال کی طرف مائل ہو چکا تھا اور محمد شاہ ثانی کو سید حسین علی اور سید عبداللہ نے جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہیں شہنشاہ ہند کی حیثیت سے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اسی زمانے میں دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا تھا اور بعدہٗ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے چڑھائی کی تو نظیر بائیس تئیس سال کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ساتھ دہلی چھوڑ کر اپنے سابق وطن آگرے

میں مٹھائی والے پل کے پاس آ کے آباد ہو گئے۔"(۱)

بعض مورخین نے یہ سوالات اٹھائے ہیں کہ اگر نظیر کا مولد دلی ہے تو پھر ان کے نام کے ساتھ "اکبر آبادی" کیوں ملتا ہے، یا "اکبر آبادی" کے نام سے کیوں مشہور ہیں؟ اس ضمن میں خود نظیر نے جو کچھ کہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ نظیر کا تعلق اکبر آباد یعنی آگرہ ہی سے تھا۔ ایک "شہر آشوب" کا یہ بند اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے:

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

خود کو آگرے کا باشندہ کہنے کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نظیر نے ہجرت کرنے کے بعد اپنی زندگی کے تمام تر ایام اسی شہر میں گزارے اور آخرش یہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔ مگر

---

(۱) بحوالہ "کلیات نظیر اکبر آبادی"، مرتبہ: عبدالباری آسی، اشاعت: ۱۹۵۱ء، ص ۳۴/۳۳

یہاں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اگر تاریخی حقائق اور حقیقی پیدائش کے واسطے سے دیکھا جائے تو نظیر دہلی کے ہیں اور دہلوی ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے بیان سے اس حقیقت پر بھر پور روشنی پڑتی ہے انہوں نے لکھا ہے:-

> ''نظیر بھی دلی سے دل برداشتہ ہوکر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ آگرے چلے آئے۔ اور تاج گنج محلے میں سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت نظیر کی عمر بیس یا بائیس برس کی ہوگی۔ اکبر آباد نظیر کو اتنا بھایا کہ دلی سے پیدائشی تعلق بھی ختم کر دیا اور دہلوی کے بجائے اکبر آبادی ہو گئے۔''(۱)

نظیر کی زندگی کے حالات وواقعات پر اگر تفصیل سے نگاہ ڈالی جائے تو بعض اہم نکتوں کی طرف ہمارا ذہن جاتا ہے۔ تاریخی شہادتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نظیر اپنے والدین کی تیرہویں اور اکلوتی اولاد تھے، جو نہایت آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ لہذا اپنے والدین اور رشتہ داران کی تمناؤں کا مرکز تھے۔ نظیر کے کان اور ناک کے چھیدوا دینے کے سلسلے کے جو اسباب تھے وہ اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ نظیر کی پرورش و پرداخت سماجی،

---

(۱) ''حرف ادب''، شجاعت علی سندیلوی، ص ۶۰

معاشرتی ،تہذیبی ،روایتوں کے پیش نظر ضرور ہوئی۔لیکن اس پرورش وپرداخت میں نازونعم کو بھی خاصادخل تھا۔

نظیر کے عہد طفلی کا ذکر بھی تفصیل سے پروفیسر شہباز نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ان کے قول کے مطابق جب نظیر چار سال ، چار ماہ اور چار دن کے ہوئے تو نہایت اہتمام کے ساتھ ان کے بسم اللہ کی رسم ادا کرائی گئی۔ایک متقی و پرہیزگار عالم کے ذریعہ سورۂ اقرا،من علق تک پڑھائی گئی۔اس کے بعد زمانے کے رواج کے مطابق والدین کی نگہداشت میں اور استاد کی شفقت کے سائے میں ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔یہاں تک کہ فارسی کتابوں کا درس حاصل کر کے اس زبان میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔اسی طرح عربی میں بھی انہوں نے اچھا خاصا درک حاصل کرلیا۔فارسی زبان میں درک رکھنے کا ذکر بیشتر لوگوں نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری کا بیان ہے:-

''ان کی فارسی کی قابلیت اچھی خاصی تھی ،عربی سے بھی ناواقف نہیں تھے۔انہوں نے عمر بھر معلّمی میں بسر کی۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مروجہ نصاب کے مطابق پڑھے لکھے ہوں گے۔کم سے کم اتنی فارسی تو ضرور جانتے ہی ہوں گے کہ اگر چاہتے تو میر یا سودا، مصحفی یا انشا، آتش یا

راسخ کے رنگ کی شاعری کو اختیار کر سکتے تھے۔ پھر ان کے کلام سے بھی
پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی زبان اور فارسی شاعری سے کافی واقف اور
مانوس تھے۔ لیکن انہوں نے بالقصد دلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے
بالکل الگ اپنا ایک رنگ نکالا۔''(۱)

سہ ماہی ''ادیب''علی گڑھ کے ایک شمارے میں محمد منظور احمد نے نظیر اکبرآبادی کی علمی اور فنی بصیرت کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''نظیر زود گو اور پر گو شاعر تھے۔ بلکہ بے باکانہ طریقے سے بے تحاشا
کہتے تھے۔ وہ ایک سمندر تھے اور ان کے اظہار میں غضب کی روانی
تھی۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ فارسی زبان اور فن شاعری پر عبور رکھنے کے
باوجود انہوں نے عوام کی زبان میں عوام کے لئے روزمرہ زندگی کے
عام موضوعات پر شعر کہے۔''(۲)

---

(۱) ''ادب اور زندگی''، مجنوں گورکھپوری، اشاعت: ۱۹۸۴ء، ص ۲۰۹

(۲) سہ ماہی ''ادیب'' جلد ۱۲، شمارہ ۴، ۱۹۸۸ء، ص ۷

''گلزار نظیر'' کے مرتب سلیم جعفر نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نظیر آٹھ زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، بھاشا، ماڑواڑی، پوربی اور ہندی زبانوں کا استعمال نظیر نہایت بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ پروفیسر شہباز نے بھی لکھا ہے کہ نظیر سات آٹھ زبانیں جانتا تھا اور ان زبانوں میں سند کی حیثیت رکھتا تھا۔

اگر نظیر اکبرآبادی کے زمانے کے حالات، سیاسی وسماجی ماحول کا جائزہ لینا ہو تو اس کے لئے نظیر کا کلام اپنے عہد کی مکمل تاریخ فراہم کرتا ہے۔ طفلی کی حد سے گزر کر نظیر جب جوانی کی دنیا میں داخل ہوئے تو محققین لکھتے ہیں کہ ان کے مزاج میں عاشقی کا غلبہ تھا۔ عاشقانہ خیالات میں گم رہنا شب وروز کا شغل تھا۔ اس سلسلے میں بھی پروفیسر شہباز ہی ہماری کچھ رہنمائی کرتے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے:-

> ''نظیر جس مزاج کا آدمی تھا وہ کبھی اپنے آپ کو میلے ٹھیلوں سے الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ انسانی حالات اور خیالات سے حکمت اور عقل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانی تھیٹر کا ایک دور اندیش اور صاحب نظر تماشائی تھا۔ وہ ڈراپ سین کے اٹھنے پر اپنی آنکھیں کسی طرح بند نہیں

رکھ سکتا تھا۔ وہ رغبت اور نفرت، رشک اور حسد، عشق و محبت کے معاملات سے تفصیلاً واقف ہونا چاہتا تھا۔ بچوں کی معصومانہ خوشی اور ان کی معصومانہ طلب اور خواہش، بوڑھوں کی متانت اور ان کی سنجیدگی اور قدرتی قناعت، عورتوں کا غرور حسن اور شوق نمائش، جوانوں کا اکڑ بل، سب اس کو اپنی طرف مشغول کر لیتے ہیں۔ تیرا کی کا میلہ ہو، کنکوے کا میلہ ہو، کبوتر بازی کا میلہ ہو، دیوالی ہو، ہولی ہو، بلدیو جی کا میلہ ہو، کوئی تقریب ہو، کسی طرح کا تیوہار ہو، سب میں اس کو جانا اور پوری طرح عاقلانہ لطف اٹھانا۔''(۱)

نظیر کی ذہانت، طباعی، اور ان کی خوش مزاجی کا تمام ناقدین اور مورخین نے تذکرہ کیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ:-

''نظیر فطرتاً خوش مزاج تھے۔ یہی خوش مزاجی ان کی زندگی اور ان کی شاعری کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ افسردگی اور اضمحلال یا خفگی اور

---

(۱)''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ص ۸۴

جھلاہٹ کو ان کی طبیعت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ انسان کو فطرتاً ایک اچھی مخلوق اور اس کی زندگی کو اصلیت کے اعتبار سے اچھی زندگی سمجھتے تھے۔''(۱)

گذشتہ اوراق میں نظیر اکبرآبادی کی شکل وشباہت کا نقشہ پروفیسر عبدالغفور شہباز اور خود نظیر کی زبان سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں مزید کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ البتہ یہاں نظیر کے معاصرین پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نظیر کا زمانہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے نہایت پرآشوب زمانہ تھا۔ باوجود اس کے فنی اعتبار سے اگر نظیر کی شاعری پر نگاہ ڈالی جائے تو نظیر کا عہد نہایت زریں عہد تھا۔ ان کے معاصرین میں مرزا محمد رفیع سودا جیسے یکتائے روزگار قصیدہ گو تھے۔ دوسری طرف غزل گوئی کے میدان میں خواجہ میر درد اور میر تقی میر جیسے اساتذہ فن موجود تھے۔ ان کے علاوہ نظیر کے دیگر معاصرین میں غالب، ذوق مومن اور انیس و دبیر کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) ''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ص ۲۸۵

نظیر ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنی شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔اور بیشتر لوگوں نے یہ بات بتائی ہے کہ نظیر شاعری میں کسی کے استاد بھی نہیں تھے۔نظیر کے ایک بڑے سوانح نگار عبدالغفور شہباز نے تو نظیر کے شاگردوں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں بتائی ہے۔لیکن ڈاکٹر محمد علی اثر نے ایک جگہ لکھا ہے:-

''نظیر کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔حکیم قطب الدین باطن جنہوں نے شیفتہ کے تذکرہ 'گلشن بے خار' کے جواب میں اپنا تذکرہ 'گلستان بے خزاں' لکھا تھا، کہ علاوہ نظیر کے چند اہم شاگردوں کے نام یہ ہیں: راجہ بلونت سنگھ، راجہ بدھ سنگھ صافی، شیخ مداری ضمیر، حکیم محمد مہندی طاہر، شیخ نبی بخش عاشق، منشی حسین خاں ماہ، بیدار بخش لہر، وغیرہ''(۱)

متذکرہ بالا سطور میں نظیر اکبرآبادی کے احوال وآثار پر اپنی بساط بھر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔اب آیئے ذیل میں نظیر کے عہد پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

فنکار چاہے جس عہد کو بھی ہو اس کی تخلیق میں اس کی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے عہد

---

(۱) ''نظیر شناسی''، مرتبہ: ڈاکٹر اکبر علی بیگ اور ڈاکٹر محمد علی اثر، ص ۳۱۴

کی عکاسی بھی ملتی ہے اور عہد ماقبل کی پرچھائیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کسی فن کار کی تخلیقات کی تفہیم وتعبیر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان زمانوں پر نظر نہ ڈالی جائے جس کے درمیان فنکار کا ذہن پرورش پا تا رہا ہے۔ میرتقی میرؔ ہوں یا نظیرؔ، مرزا غالبؔ ہوں یا بہادر شاہ ظفرؔ ان تمام فن کاروں کی شاعری اپنے تاریخی تناظر کی تفہیم کے بعد ہی مکمل طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔ خاص طور پر ایسے شعرا جن کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی شعور زیادہ بالیدہ رہا ہے اور جنہوں نے اپنی شاعری میں تفصیل کے ساتھ اپنے زمانے کے اثرات کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی سے بھی اثرات قبول کئے ہیں، ان کے فن کو تو عصری وسیاسی جائزے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی شخصیت کی تعمیر میں سیاسی اتھل پتھل کو بڑا دخل رہا ہے۔ مغلوں کے اقتدار کا نشیب وفراز اور زمام حکومت کے پھسلتے ہوئے واقعات تو خاصے طویل ہیں، لیکن دہلی اور آگرہ اور اس کے آس پاس کے خطوں میں برپا ہونے والے سیاسی اور سماجی طوفانوں کو تو بہر حال سامنے رکھنا ضروری ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی پیدائش بہ اتفاق رائے ۱۷۳۵ء ہے اور سال وفات ۱۸۳۰ء ہے۔ نظیر نے خود اپنی عمر سو برس بتائی ہے:

اے یار سو برس کی ہوئی اپنی عمر آکر

اور جھریاں پڑیں ہیں سارے بدن کے اوپر

دکھلاتے جس گھڑی ہیں میداں میں زور جاکر

رستم کو بھی سمجھتے اپنے نہیں برابر

اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب کی وفات یعنی ۱۷۰۷ء سے لے کر نظیر آبادی کی پیدائش اوران کی فن کاری کے عہد کواس لئے بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اسی دور میں نظیر کا شعور ایک خاص نہج پر ڈھل کر سوچنے کے لئے تیار ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ دور ہے جب مغل اقتدار کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اکبر بادشاہ نے جس طرح ہندوستانی کلچر اور یہاں کی تہذیب وتمدن کو سامنے رکھ کر حکومت کرنے کا ایک دانشمندانہ طریقہ اپنایا تھا، اورنگ زیب کی سفاک شخصیت نے اسے قبول نہیں کیا۔ اورنگ زیب کے بعد اگر چہ بہادر شاہ ظفر نے اس بات کی کوشش کی کہ سیاست کو عقیدے کے تحفظ سے الگ رکھا جائے اور سماجی زندگی کے سلسلے میں ایک نرم او رمعتدل رویہ اختیار کیا جائے۔ لیکن معاملہ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ حالات سنبھل نہیں پا رہے تھے او رہندوستان کے پورے طول وعرض میں ایک طرح کا

Disintegeration پیدا ہو گیا تھا۔ یہ مسئلہ سامنے آچکا تھا کہ اقتدار کا مقصد صرف عام زندگی میں صلح ، اعتدال اور توازن پیدا کرنا ہونا چاہئے یا تہذیبی و تمدنی عناصر کی ترویج بھی اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے ـــــ غرض ایک عجیب قسم کی افراتفری کا عالم تھا۔ مغلیہ حکومت میں داخلی انتشار کے علاوہ عوام کی سطح پر بھی پریشانیاں لاحق تھیں۔ خانہ جنگی اور آپسی رسہ کشی نے بیرونی طاقتوں کو امداد پہنچائی ۔ ایسی صورت حال میں نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے ایک تہلکا مچا دیا۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنی کتاب ''نظیر اکبر آبادی'' میں ایک جگہ لکھا ہے:-

> ''خانہ جنگی کی وجہ سے باہر کی طاقتوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ماضی میں بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ایسے ہی نازک ماحول میں نادرشاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے مغل حکومت کے کمزور ڈھانچے پر ایک کاری ضرب لگائی۔ اس نے نہ صرف زوردار حملہ کیا بلکہ مسلسل تقریباً دو ماہ تک لوٹ مار کی اور دولت و ثروت کا ایک کثیر سرمایہ لے کر فرار ہو گیا۔''(۱)

---

(۱) ''نظیر اکبر آبادی''، علی احمد فاطمی، اشاعت: ۱۹۸۳ء، ص ۱۸

اپنی اسی کتاب میں علی احمد فاطمی صاحب نے ''حکایت ہند'' ص ۵٦اور۵۷کے حوالے سے نادرشاہی حملے کی شدت ان الفاظ میں بیان کی ہے:-

''جوصعوبت کہ ستم رسیدہ باشندگان دہلی پر نادرشاہ اوراس کے وحشی سپاہیوں کے ہاتھ پہنچی بیان سے باہر ہے...... جب قتل کرتے کرتے تھک گئےتو اس نے بادشاہ اوررئیسوں کا خزانہ لوٹااور جنہوں نے اپنا پوشیدہ اسباب نہ بتایاان کوموت کے گھاٹ اتاردیا۔''(۱)

محمد شاہ کے بعد اس کے بیٹے احمد شاہ کا عہد (۵۴-۱۷۴۸ء) عین وہی عہد تھا جس میں نظیر اکبرآبادی کے لئے تخلیقی مواد مہیا ہو رہا تھا۔اس کی عیاشی اور نا اہلی نے ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔زندگی کی صالح قدروں کوموجودہ حالات سے دست و گریباں ہونا پڑ رہاتھا۔اب یہ بات خاص طور پر سامنے آچکی تھی کہ اقتداراور دولت وثروت نے کمزورطبقوں کوگزند پہنچانے کی کوشش کی۔قدروں کی پامالی سے نظیراس طرح متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقتدار، دولت وثروت ،سرمایہ داری اورعیش وعشرت کے مقابلے میں عوامی

---

(۱)''حکایت ہند''،ص ۵٦

زندگی اور محنت کش طبقے کے طرز حیات کو اپنے لئے پسندیدہ بنالیا تھا۔ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب ''تاریخ اہل ہند'' میں اس صورت حال کی تصویر یوں اتاری ہے:۔

''سلطنت مغلیہ پر بڑی حد تک زوال آچکا تھا۔ بادشاہوں کے جمع کئے ہوئے خزانے خانہ جنگیوں کی وجہ سے خالی ہو چکے تھے۔سلطنت کے نظم ونسق میں ابتری مچی ہوئی تھی۔ مال گزاری مشکل سے وصول ہوتی تھی۔عہدہ داروں کی تنخواہیں چڑھی رہتی تھیں اور بادشاہوں کے بار بار بدلنے سے شاہی افسروں کی وفاداری میں خلل پڑنے لگا تھا۔ خانہ جنگیوں اور راجپوتوں، سکھوں، جاٹوں اور مراٹھوں کے خلاف مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے پرانے امرا کا خاتمہ ہوگیا تھا۔نہ فوج میں کارگزاری کی لیاقت اور مستعدی باقی رہی تھی اور نہ اس کے سپہ سالاروں میں پشتینی بہادری اور وفاداری۔ بادشاہ سے لے کر ادنیٰ عہدے تک پورے حکمراں طبقے کی اخلاقی حالت خراب ہوگئی تھی، ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی تھی۔سلطنت کی بہبودی کا کسی کو خیال نہ تھا۔''(۱)

---

(۱)''تاریخ اہل ہند''، ڈاکٹر تارا چند

قاضی الدین جو اول اول محض وزیر تھا ایک صاحب فراست شخصیت کی طرح ابھرا۔ اس نے محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد میں اپنے آپ کو اس حد تک مضبوط بنالیا کہ احمد شاہ کو گدی سے اترنا پڑا، اور عالم گیر ثانی نے اس کی جگہ اختیار کر لی۔ عالم گیر ثانی کا عہد حکومت ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک تھا۔ اسے عام طور پر مطالعے اور معاشقے کا شوق تھا۔ چنانچہ اس کے وزرا حکومت کے امور میں زیادہ حاوی ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب اور دہلی پر حملہ کر دیا۔ لوٹ مار مچ گئی اور حکومت کا اتحاد منتشر ہو گیا۔ دلی، فرید آباد، متھرا اور آگرہ میں خوب خوب خوں ریزیاں ہوئیں ۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے یہ ماجرا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> ''............اور اس طرح احمد شاہ ابدالی نے تقریباً دس حملے کئے اور تمام متحدہ قوتوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ بے پناہ لوٹ مار کی اور اس بار دہلی، فرید آباد، متھرا اور آگرہ اس کے لوٹ کے چپیٹ میں آئے۔ قتل و خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ جا بجا لاشوں کے ڈھیر لگ گئے ۔ جاٹوں، مرہٹوں کو خوب خوب سزائیں دیں۔ ہزار ہا جاٹ تہہ تیغ کر دئے گئے۔ عورتوں ، بچوں نے ندی، کنوؤں میں کود کود کر اپنی جانیں دے

دیں۔دولت کا ایک لامتناہی حصہ اپنے قبضے میں کرلیا۔''(۱)

ڈاکٹرسرکار نے ایک نقشہ یوں کھینچا ہے:-

''دلی سے آگرہ تک لوٹ مار میں بے پناہ دولت اسے حاصل ہوئی تھی۔اسے وہ ۲۸ ہزار اونٹوں، ہاتھیوں، خچروں وغیرہ میں لاد کر لے گیا تھا۔اس کے سوار پیدل چل رہے تھے کیونکہ گھوڑوں پر لوٹ کا مال تھا۔''(۲)

یوں پورا کا پورا انظام درہم برہم ہوگیا۔جو رئیس اور امیر تھے وہ فقیر ہو گئے اور مالی اعتبار سے پسماندہ لوگ صاحب ثروت بن گئے۔مغلوں کی رو بہ زوال حکومت، جاٹوں اور مرہٹوں کی سرکشی، باہمی تصادم، لوٹ مار اور قتل و غارت گری نے پورے معاشرے میں وحشت پیدا کردی تھی۔شرفا کے طبقے میں اجتماعی طور پر خوف ابھرآیا تھا۔عیاشی، بدفعلی، اور مادی عیش و عشرت نے انجام کار کے ردعمل کے طور پر سوچنے والے ذہنوں میں بے ثباتی اور صوفیانہ

---

(۱) ''نظیر اکبرآبادی''، علی احمد فاطمی، اشاعت:۱۹۸۳ء، ص۲۴

(۲) ڈاکٹر سرکار بحوالہ: ''نظیر اکبرآبادی''، علی احمد فاطمی، اشاعت:۱۹۸۳ء، ص۲۴

بے نیازی کے اقدار پیدا کر دئے۔ گویا معاشرے کے منفی اور انسانیت کش رویے کے مقابلے میں تصوف، درویشی اور دنیا سے گریز کی ایک مساوی لہر چل پڑی تھی۔ نظیر اسی لہر کے ایک نمائندہ فنکار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر نے آگرہ اور اس کے اردگرد کی تباہ حالی اور بربادی سے تنگ آکر لکھنو کا رخ اختیار نہیں کیا۔ بلا شبہ خطہ اودھ میں عیش وعشرت اور خوشحالی کا ماحول تھا لیکن نظیر نے آگرے کے باشندوں سے دلچسپی لی، اور وہاں کے عوام کے دردوغم اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اپنی شخصیت کو ضم کر دیا۔ ان کے یہ اشعار آگرے سے ان کے اٹوٹ تعلق کے غماز ہیں:

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے

ملا کہو، دبیر کہو، آگرے کا ہے

مفلس کہو، فقیر کہو، آگرے کا ہے

شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

آگرہ یعنی شہر اکبر آباد نظیر کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں اہم کارنامہ انجام دیتا ہے۔ انہوں نے جو نظم شہر اکبر آباد کے نام سے سپرد قلم کی ہے وہ اسی جذباتی انسلاک کی غماز ہے جس میں نظیر کی شخصیت پہچانی جاسکتی ہے:

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مکاں

کیوں کر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں

دیکھی ہے آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں

ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں

رکھیو الٰہی اس کو تو آباد و جاوداں

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نور گستری

شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارض و پری

ہر شام بھی وہ مشک و ملاحت سے ہے بھری

لیلیٰ کی جعد کر نہ سکے جس کی ہمسری

دن روئے مہر طلعت و شب زلف مہوشاں

بارات پر بہار و عمارات پر نگار

بازار وہ کہ جس پہ چمن دل سے ہو نثار

محبوب دلفریب و گل اندام و گل عذار

گل بن کہے ہیں آپ کو گلزار پر بہار

کوچے کہے ہیں اپنے تئیں صحن گلستاں

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام

ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام

ہر طور دل رہے ہے خوش طبع شاد گام

میری نظیرؔ دل سے یہی ہے دعا مدام

ہنستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

ایسا نہیں ہے کہ نظیر نے آگرہ اور اس خطے کے مسائل و مصائب بیان نہیں کئے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں اس علاقے اور اس عہد کے پورے ماحول کو منقش کر دیا ہے۔ وہاں کے میلوں ٹھیلوں، تفریحوں، در و دیوار کی صورت حال، کھیل تماشوں اور بازاروں اور عوامی رسم و رواج کو اس طرح اپنی شاعری کا جزو بنا دیا ہے کہ اس سے نظیر کے ایک مخصوص ڈکشن کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگرے کی صورت حال کو اپنے ''شہر آشوب'' میں وہ اس طرح متحرک بنا کر پیش کرتے ہیں:

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ

آتا نظر کسی کو نہیں ایک دم نباہ

مانگو عزیز ایسے برے وقت سے پناہ

وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ

کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

کیوں کر بھلا نہ مانگئے اس وقت سے پناہ

محتاج ہو جو پھرنے لگے در بدر سپاہ

یاں تک امیر زادے سپاہی ہوئے تباہ

جن کے جلو میں چلتے تھے ہاتھی وگھوڑے آہ

وہ دوڑتے ہیں اور کے پکڑے شکار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات

سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات

کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہئے بات

روزی کے اب درخت کے ہلتا نہیں ہے پات

ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ

پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ

ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ

وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ

جس کا نہ باغباں ہو نہ مالی نہ خار بند

اس نکتے کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نظیر نے صورت حال کی صرف خارجی عکاسی ہی نہیں کی ہے بلکہ ان کے ذریعہ درویشانہ اور صوفیانہ تصورات اور محسوسات کو بھی پیش کیا ہے۔ اس خطے کی بے روزگاری، افلاس، غریبی، لوٹ مار اور جنگ وجدل کی خارجی ترجمانی کے ساتھ اس صورت حال سے جو عبرت اور درس حاصل کیا جاسکتا ہے نظیر نے اس کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ اپنی نظم ''در بیان تماشائے دنیائے دوں'' میں وہ کہتے ہیں:

بنا کے نیار یا زر کی دوکان بیٹھا ہے

جو ہنڈی والا ہے وہ خاک چھان بیٹھا ہے

جو چور تھا سو وہ پاسبان بیٹھا ہے

زمین پھرتی ہے اور آسمان بیٹھا ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

زباں ہے جسکی اشارت سے وہ پکارے ہے

جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بگھارے ہے

کلاہ ہنس کی کوا کھڑا اتارے ہے

اچھل کے مینڈ کی ہاتھی کے لات مارے ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

جنہوں کی داڑھی ہے ان کی تو بات واہی ہے

جو داڑھی منڈے ہیں ان کی سند گواہی ہے

سیاہ روشنی اور روشنی سیاہی ہے

اجاڑ شہر میں مردوں کی بادشاہی ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

نظیر نے اپنی شخصیت کو عوام الناس کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس عہد کی مقامی تہذیب اور کلچر کو بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ چونکہ آگرہ ان کا مسکن و مرجع بھی تھا اس لئے وہاں کی تباہی انہیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

توڑے کوئی قلعے کو کوئی لوٹے شہر کو

اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ

اک بار گی تو اب مجھے یارب تو پھر بسا

کرتا ہے اب خدا سے یہ فریاد آگرہ

تباہی اور بربادی کے خارجی وقوعے نظیر کو اپنی ذات کے اندرون تک لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے فکر و احساس میں صوفیانہ فکر و رجحان نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ''روٹیاں''، ''موت''، ''تلاش زر''، ''مفلسی''، ''آدمی نامہ''، ''بنجارہ نامہ''، ''کلجگ'' جیسی نظموں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کا خارجی تجربہ و مشاہدہ ان کے اندرون میں سفر کرنے لگتا ہے۔

پروفیسر عبدالغفور شہباز نے ''زندگانی بے نظیر'' میں نظیر کی شخصیت اور ان کے عہد کے حالات کو تحقیق و تدلیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب (زندگانیٔ بے نظیر) ایک طرف نظیر کی شخصیت کی عکاسی پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ان کے عہد کے حالات کی ایک زندہ تصویر ہے۔ کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پروفیسر شہباز نے نظیر کے عہد کی نہایت معتبر تصویر پیش کردی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر آچکا، انہوں نے نظیر کی نواسی ولایتی بیگم سے بھی اس سلسلے میں مدد لی ہے۔ نیز اس عہد کے آگرے کے بعض لوگوں سے براہ راست رابطہ قائم کر کے معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لئے ان کے مستند

ہونے میں کوئی شک نہیں ۔نظیر کے والد محمد فاروق کی شادی آگرے کے نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ بن اختر خاں کی صاحبزادی سے ہوئی ۔نظیر کے حالات رقم کرتے ہوئے پروفیسر شہباز نے اس عہد کے سیاسی وسماجی نقشے بھی پیش کئے ہیں ۔وہ لکھتے ہیں :-

''دہلی جہاں وہ پیدا ہوا، جہاں اس نے پرورش پائی، جہاں وہ جوان ہوا، اس کو ایک تازہ اور بڑی آفت کا سامنا نادر کو اپنی خوں ریزیوں کا سکہ بیٹھا کر گئے ہوئے زمانہ نہیں ہوا۔ظالم کی عمر کوتاہ۔ گو وہ اس جہان سے جا چکا ہے مگر احمد شاہ ابدالی اس کا جانشین موجود ہے ۔اس کے دو حملے متواتر ہو چکے ہیں......نظیر کو گو نادر شاہ کے حملے کے وقت ہوش نہ تھا۔مگر ہوش سنبھلتے ہی اس کی ہوش اڑانے والی داستان سننے لگا۔پھر نظیر کو بلا کر کہا گیا کہ بابا یہ شہر اب رہنے کے قابل نہیں ۔تم کو کیا خبر،تم اس مصیبت کو کیا جانو۔ہم لوگ اپنی آنکھوں سے اس ولایتی گڈریے کے کرتوت دیکھ چکے ہیں۔ بس جیسے ہی احمد شاہ نے تیسرا حملہ کیا (۱۷۵۶ء) لوٹ مچی اور جان و مال کی خیر نہ رہی تو بھگڈر مچ گئی ۔تو بس فیصلہ لے لیا گیا......عورتوں کی اشک آلود تقریر سن کر نظیر بے چین

ہو گئے تو جس طرح بن پڑا اسباب سمیٹا اور سواریوں کوٹھکانے سے رکھا

اور یہ قافلہ آگرے کو روانہ ہوا۔'' (۱)

نظیر کی زندگی، ان کے والدین کے حالات، اس عہد میں ہونے والے نادرشاہ کے حملے اور اکبرآباد اور دہلی کی اجڑتی ہوئی رونق کی تفصیلات متعدد اہل قلم اور محققین نے اپنے اپنے انداز میں پیش کئے ہیں۔ ان تمام تحریروں کے مطالعے سے ایک قطعی نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم میں نظیر اور ان کے عہد کے سلسلے میں جو معلومات فراہم کئے ہیں اس کا ایک حصہ کچھ یوں ہے:-

''شیخ ولی محمد، نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء) پے در پے بارہ اولادوں کے مرنے کے بعد بڑے چاؤ ارمان سے پیدا تو دہلی میں ہوئے لیکن نوعمری ہی میں اپنے والدین کے ساتھ اکبرآباد چلے آئے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ یہ زمانہ دہلی کی تباہی کا زمانہ تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ کے حملے نے قتل عام کے ساتھ ساری دنیا کو لوٹ

---

(۱) ''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ص ۱۰۷

کر معاشی وفوجی طور پر اس کی کمر توڑ دی تھی۔ اس وقت نظیر چار پانچ سال کے تھے۔ جن صاحبان علم نے نظیر پر قلم اٹھایا ہے ان میں بیشتر اس بات پر متفق ہیں کہ نظیر ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان ناموں میں مرتب کلیات نظیر عبدالباری آسی، مرزا فرحت اللہ بیگ اور سلیم جعفر شامل ہیں۔ عبدالباری آسی نے ۱۷۳۵ء کو ۱۱۴۸ھ کے مطابق بتایا ہے جب کہ فرحت اللہ بیگ اور سلیم جعفر نے ۱۷۳۵ء کو ۱۱۴۷ھ کے مطابق بتایا ہے۔ لیکن عیسوی سن ۱۷۳۵ء پر سب متفق ہیں۔ ہم نے یہی سال پیدائش اختیار کیا ہے۔ نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) نے عوام و خواص سب کو اس درجہ خوف زدہ کر دیا تھا کہ اب وہ کسی نئے حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آٹھ نو سال بعد جب دہلی میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں دہلی کی طرف بڑھ رہی ہیں تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے دلی چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ ۱۷۴۸ء کا سال ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ اسی زمانے میں نظیر کے والدین دہلی چھوڑ کر اکبر آباد چلے گئے اور محلّہ تاج گنج میں کرائے کا مکان لے کر رہنے

لگے۔اسوقت نظیر کی عمر تیرہ برس تھی۔ یہ عمر کھیل کود اور تماشوں کی عمر ہے۔
اکبر آباد قدیم شہر تھا اور اس نے شہنشاہ اکبر کا دور عروج اور دار الحکومت کے
رونقوں کو اب بھی یاد رکھا تھا۔نظیر پرانے اکبر آباد میں نہیں بلکہ بیرون شہر
غریب غربا کے محلّہ تاج گنج میں رہتے تھے۔اس عمر میں ہم عمر لڑکوں کے جو
مشغلے تھے ان میں نظیر نے بھی دلچسپی لی ہوگی۔ان کی شاعری میں جو یہ سب
چیزیں بیان میں آئی ہیں وہ دور کے تماشائی کا تاثر نہیں دیتی بلکہ معلوم
ہوتا ہے کہ وہ ان سب مشغلوں میں ڈوب کر شریک رہے ہیں اور سارے
میلے ٹھیلوں ، کھیل کود، تماشوں ،تہواروں ، مقابلوں وغیرہ میں پوری طرح
حصہ لیا ہے۔اسی لئے انکی شاعری اس دور کی عوامی زندگی سے قریب ہے۔
یہی ان کی زندگی تھی اور اسی کی ترجمانی انہوں نے تخلیقی سطح پر اپنی شاعری
میں کی ہے۔ان کا مسدس 'اشتیاق دیدار' دیکھئے جسمیں انہوں نے اپنے
مشاغل کو بیان کیا ہے جن میں عشق بازی بھی شامل ہے۔'' (۱)

---

(۱) ''تاریخ ادب اردو''، جلد سوم، جمیل جالبی، ص ۱۰۰۶

نظیر نے تمام تر خارجی مشاہدے کے باجود آزادانہ زندگی گزاری عمر کا ایک بڑا حصہ درس و تدریس میں گزارا۔ کبھی آگرے کے رئیس نواب محمد علی خاں کے لڑکوں کو تعلیم دی، کبھی لالہ بلاس رائے کھتری کے بچوں کو تعلیم دی چنانچہ کریم الدین نے اپنے تذکرے ''طبقات الشعرائے ہند'' میں نظیر کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حلیم و خلیق اور متواضع اور غریب آدمی تھا۔ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا۔''

نظیر کے مزاج میں فخر و تعلّی نام کو بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

کہتے ہیں جس کو نظیر سنئے ٹک اس کا بیاں

تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں

کوئی کتاب اسکے تئیں صاف نہ تھی درس کی

آئے تو معنی کہے ورنہ پڑھائی رواں

فہم نہ تھا علم سے کچھ عربی کے اسے

فارسی میں ہاں مگر سمجھے تھا کچھ این و آں

لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کبھی

پختگی و خامی کے اس کا تھا خط درمیاں

شعر وغزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اسے

اپنے اس شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں

سست روش پست قد سانولا ہندی نژاد

تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد میں موافق عیاں

ماتھے پہ اک خال تھا چھوٹا سا مسے کے طور

تھا وہ پڑا آن کر ابروؤں کے درمیاں

وضع سبک اس کی تھی، تس پہ نہ رکھتا تھا ریش

مونچھیں تھیں اور کانوں پہ پٹے بھی تھے پنبہ ساں

پیری میں جیسی کہ تھی اس کو دل افسردگی

ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں

جتنے غرض کام ہیں اور پڑھانے کے سوا

چاہئے کچھ اس سے ہوں، اتنی لیاقت کہاں

فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر

عزت وحرمت کے ساتھ پارچہ وآب وناں

نظیر اکبرآبادی کی نظر اپنے عہد اور معاشرے پر نہایت گہری تھی اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں اس عہد کے ماحول کے تمام گوشے منور کر دئے ہیں۔ سارے کھیل تماشے، چوسر، شطرنج، پتنگ بازی، کبوتر بازی، لال بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، گلہری پروری، دیوالی، ہولی، راکھی، بسنت، دسہرہ وغیرہ — غرض زندگی کے متعدد پہلو جس طرح نظیر کی شاعری میں پیش ہوئے ہیں ان سے اس عہد کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس تصویر میں سیاسی سماجی اور ثقافتی حالات ایک دستاویز کی طرح موجود ہیں۔

نظیر کا سماجی وتہذیبی شعور نہایت بالیدہ تھا۔ خارجی تصویر کے ساتھ ساتھ حالات کے سلسلے میں نظیر کا اپنا تبصرہ ایک زبردست تنقیدی بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ باتیں نظیر کے طنزیہ لہجے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے اپنے عہد اور عصر پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ عہد کچھ عجیب مضحکہ خیز اور ریاکاری کا تھا۔ جن میں زور نہیں وہ کشتی لڑتے اور جو طاقت ور ہیں وہ پچھڑ رہے ہیں، کبڑے چھاتیاں نکالے پھر رہے ہیں، جو پر والے ہیں وہ اڑنے کی بجائے پاؤں پیدل چل رہے ہیں، جن کے پر نہیں وہ پنکھے جھلتے پھر رہے ہیں، لنگڑے لولے اچھلتے کودتے پھر رہے ہیں، چور پاسبان بنے بیٹھے ہیں، چکوروں نے منہ چھپا لیا ہے اور گدھ اور الو چھا گئے ہیں۔ چغد کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔

بلبلیں نماز اور طوطے قرآن پڑھ رہے ہیں۔ مور لنڈورے پھر رہے ہیں اور بطوں کی دمیں لمبی ہوگئی ہیں۔ گونگے فارسی بگھار رہے ہیں، کوا ہنس کی کلاہ اتار رہا ہے۔ مینڈ کی اچھل کر ہاتھی کو لات مار رہی ہے، جو نجیب ہیں وہ غلام ہیں اور کمینے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں، باز شکرے پاپڑ بیل رہے ہیں اور الو شکار کھیل رہے ہیں، داڑھی والوں کی بات غیر مستند اور داڑھی منڈوں کی گواہی سند ہے، اب سیاہی روشنی اور روشنی سیاہی بن گئی ہے، شہر اجاڑ ہیں اور مردوں کی بادشاہی قائم ہیں۔ جو عقل والے ہیں وہ باؤلے اور دیوانے کہے جا رہے ہیں اور جو بے عقل ہیں وہ ہوشیار اور سیانے سمجھے جا رہے ہیں۔ ساہوکار چور لٹیروں کی طرح دن دہاڑے لوٹ رہے ہیں۔ سلیمان بھوکے ہیں اور چونٹیوں کا ذخیرہ ہے۔

یہ حقائق نظیر نے اپنی منظومات میں پیش کئے ہیں اپنی نظم ''مذمت اہل دنیا'' میں بھی اپنے عہد کا خوبصورت اور حقیقی نقشہ پیش کیا ہے:

ہوشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا

یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

یہ صحیح ہے کہ نظیر مصلح اور ناصح ہونے اور صورت حال کو بدل دینے کا دعویٰ نہیں کرتے لیکن اپنے عہد اور ماحول پر وہ جس طرح طنزیہ نظر ڈالتے ہیں اس سے تعمیر و اصلاح کا

ایک پہلو بہر حال اجاگر ہوتا ہے۔خوشامد کی فلاسفی ہو یا آدمی نامہ یا ان جیسی دوسری نظمیں، ان سبھوں میں سماجی، تہذیبی اور ثقافتی صورت حال کی پیش کش کے ساتھ کچھ تعمیری قدریں ابھرتی ہیں جو صاحبان فکر اور حساس افراد کو اس بات پر اکساتی ہیں کہ اس دگرگوں صورت حال کو بدلنا چاہئے۔

نظیر کی شاعری میں جو عہد و عصر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ظاہر کہ وہ صرف نظیر کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ وہ خارجی حقائق ہیں جن کا تعلق ہماری سیاسی، سماجی اور ثقافتی تہذیب سے ہے۔ یہ آئینہ اسی وقت صاف وشفاف صورتیں دکھا سکتا ہے جب ہم سماجی زندگی کے حال کو ماضی سے وابستہ کریں اور اسی طرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ عہد حاضر کے شعری وادبی ڈھانچے کو ماضی کی اقدار ادب کی روشنی میں رکھ کر دیکھا جائے۔ ہر بڑا فن کار جہاں اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے وہاں ماحول پر اپنے اثرات بھی ڈالتا ہے۔ اور فنکار کا ماحول ماضی کی اقدار حیات اور اقدار ادب سے بہر حال وابستہ رہتا ہے۔خود آگرہ جو نظیر کی ذاتی شخصیت اور تخلیقی شخصیت کی تکمیل میں اہم رول ادا کرتا ہے، امتداد زمانہ کی وجہ سے تغیرات میں مبتلا رہا۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ ''ذکر میر'' میں اس تغیر کا ہلکا سا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

''تیس برس بعد اکبر آباد پہنچا اور والدہ وعم بزرگوار کے مزاروں کی

زیارت کی ۔ وہاں کے شعرا بھی مجھے استاد فن سمجھ کر مجھ سے ملنے آئے ۔ دو تین بار شہر بھی گیا اور وہاں کے شعرا، علماء وفقراء سے بھی ملا لیکن کوئی ایسا مخاطب نہیں جس سے دل بیتاب کو تسلی ہوتی، نہیں ملا۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ یہ وہ شہر ہے جس کی ہر گلی کوچے میں عارف، کامل، شاعر، منشی، دانشمند ملتے تھے آج وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی کہ اس سے باتیں کر کے لطف اٹھاؤں۔ سارا شہر ایک ویرانہ ہے، جس سے ایک وحشت ٹپکتی ہے میں چار مہینے رہا۔ وہاں سے پھر سورج مل کے قلعوں میں واپس آ گیا۔"(۱)

مغلوں کی کمزور ہوتی ہوئی حکومت، جاٹوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی پھیلائی ہوئی افراتفری اور اقتدار کے حصول کی کشاکش جیسے عناصر نے مل کر سماجی اور سیاسی حالات کو ابتر بنا دیا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے:-

"نظیر نے شہر آشوب میں ان بے روزگاروں کا ماتم کیا ہے۔ یہ نظم نہیں

---

(۱) "ذکر میر"، میر تقی میر، ص ۱۰۴

اکبر آباد کی روح کی پکار رہے اور یہ پکار محلوں کوٹھیوں کی نہیں بلکہ

دکانداروں، فقیروں، مصوروں اور شاعروں کی پکار ہے۔''(۱)

اس افراتفری نے زندگی کو بے سمتی کا شکار کر دیا تھا۔ چنانچہ سماجی زندگی میں اگر ایک طرف دینداری، تصوف اور خدا ترسی کے رجحانات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف عیش وعشرت کے رجحانات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ماضی کی روایتوں کے اخذ وترک کے سلسلے میں نظیر اکبر آبادی کے یہاں یک سمتی کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہ شعر وادب میں اپنی سابقہ روایات سے انحراف کر کے لوک ادب کی طرف سے بے نیازی کے آثار ملتے ہیں اور تخلیق کاروں کی کثرت نے ابتدائی اور سادہ اقدار سے گریز کر کے پر تکلف بلکہ پر تصنع ادب کی تخلیق کا ماحول اپنا لیا۔ اس منظر نامے کو سامنے رکھا جائے تو نظیر کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ اہمیت اس لحاظ سے کچھ اور بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے ان راستوں پر چلنا زیادہ مناسب سمجھا جن کا سرا روایات سے ملتا ہے۔ ایک طرح سے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نظیر نے اپنے عہد کے مروجہ تخلیقی دھارے سے ہٹ کر اور اس کے خلاف ماضی کی

---

(۱) ''نظیر نامہ'' مرتبہ: شمس الحق عثمانی، ص ۲۱۴

روایتوں پر چلنا زیادہ اہم تصور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کی شاعری میں لوک ادب کے اثرات زیادہ ملتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ لوک ادب دیہی زندگی کی گذشتہ اقدار سے موافقت کا نتیجہ ہے۔ نئے سیاسی سماجی حالات نے نظیر کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ عہد موجود انتشار کا شکار ہے اور زندگی اور ادب کی سچی اور تہدار قدریں ماضی کی بازیافت کے ذریعہ بھی حاصل ہوسکتی ہیں۔

عام طور پر اردو کا تعلق چونکہ شہری زندگی کے ڈھانچے سے رہا ہے اس لئے بلند تر معاشرہ اور بہتر طبقہ اس پر حاوی ہو گیا۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اردو شعر وادب نے بہت دور تک طبقہ اشرافیہ کی معاشرت اور ذہنیت کی ترجمانی کی ہے۔ ہمارے یہاں نظیر پہلے باقاعدہ فنکار ہیں جنہوں نے اپنی اصل تلاش کی ہے اور لوک کلچر کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلچر اور ماحول کے فرق نے آہستہ آہستہ لوک ادب کو پس پشت ڈال دیا۔ شکیل جہانگیری نے ٹرانس ماگس ڈاک مے (Trans Maguas Duchme) کا حوالہ دیتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ:-

''حقیقی لوک ادب اور موسیقی صرف وہی ہے جو شائستہ ادب کے عالم وجود میں آنے سے پہلے تخلیق ہو چکی تھی۔ بعد میں شائستہ تہذیبوں نے

تخلیقی ادب کا آغاز کیا۔ یہ ادب اپنی سادگی اور عمومی تاثر کے اعتبار سے لوک ادب سے مشابہ تھا۔ لہذا اسے مقبول عام یا لوک نما (Folk like)ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اتفاق سے یہ ادب اس وقت سامنے آیا جب معاشرہ دوحصوں یعنی 'شائستہ' اور 'لوک' میں تقسیم ہوا۔ اور انجام کار تیسرے مرحلے میں لوک سماج نے شائستہ تہذیب کا وافر عنصر اپنے اندر جذب کرلیا۔ اور اس طرح حقیقی لوک ادب عنقا ہوگیا اور اس کی جگہ لوک نما ادب نے لے لی۔''(۱)

اپنے اسی مقالے میں شکیل جہانگیری لوک ادب کے سلسلے میں اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ان کا یہ خیال بھی دیکھئے:-

''لوک ادب اس ادب کو کہتے ہیں جس کا وسیلہ اظہار تکلمی زبان ہے۔ لوک ادب وہ ادب ہے جو کسی تاریخ کے کسی بھی لمحے میں دنیا کے ہر حصے میں ہر پیڑھی کے لئے قابل قبول ہے۔ سینہ بہ سینہ منتقلی اور زبانی

---

(۱) بحوالہ: ''اردو کی عوامی روایت چہار بیت کے حوالے سے''، شکیل جہانگیری، ص ۳۲-۳۱

ترسیل لوک ادب کا خاص حصہ ہے۔لیکن تحریری شکل دینے سے وہ لوک ادب کے زمرے سے خارج نہیں ہوتی بلکہ عوام میں پھیلانے میں مدد ملتی ہے۔''(۱)

نظیر نے لوک گیت کی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے اپنے عہد کے نیم ترقی یافتہ خطوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ان معنوں میں نظیر نے اجتماعی ذہن کا اعتراف کیا ہے۔محنت کش عوام کے دکھ درد اور مسرت و شادمانی کے لمحوں میں پیدا ہونے والے محسوسات کو ہی نہیں بلکہ ان کے اجتماعی فکری آہنگ کو اور ان کے طریقہ فکر کو بھی نظیر نے اپنی شاعری میں محفوظ کرلیا ہے۔مصائب حیات سے نجات پانے کی ازلی خواہش جو ہر طبقے میں الگ الگ انداز سے پائی جاتی ہے، اسے نظیر نے بھی پیش کیا ہے،اس اختصاص کے ساتھ کہ انہوں نے ان پڑھ، دیہاتیوں اور سادہ دل مزدوروں اور غریبوں کے جذبات پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔روزمرہ کی زندگی میں نیم ترقی یافتہ تہذیب و کلچر میں ساس سسر کے جھگڑے، ساس بہو کی لڑائی اور ان کا باہمی سلوک،نند کے طنز، بھائی بہن کی جدائی،شوہر کا پردیس چلے

---

(۱)''اردو کی عوامی روایت چہار بیت کے حوالے سے'':شکیل جہانگیری،ص ۲۴

جانا —— یہی نہیں بلکہ باہمی رشتوں میں بلاتکلف گالیوں کا استعمال، عورت کا بانجھ پن، شوہر کے لات گھونسے اور اسی طرح کے وہ موضوعات جو کلچر کو پیش کرتے ہیں اور جو لوک گیت یا لوک ادب کا ضروری حصہ ہیں نظیر کے یہاں بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ لوک گیت کے سلسلے میں ایک جگہ اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں:-

''لوک گیتوں کے الفاظ سادہ، لوچ دار اور نرم و نازک ہونے کے باوجود لوک گیت کار کے خیال میں ترسیل جذبات میں جب کبھی کمی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ عام شاعری کے مثل تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتا ہے اور وہ ترسیل جذبات میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی تشبیہیں اور استعارے روزمرہ کی زندگی میں دیکھی بھالی چیزوں سے لئے جاتے ہیں۔ جو واقعیت اور حقیقت سے نہ صرف قریب بلکہ حقیقی ہوا کرتے ہیں۔ ان میں ماورائیت کم اور مادیت اور حقیقت زیادہ ہوتی ہے۔''(۱)

---

(۱) ''اتر پردیش کے لوک گیت''، اظہر علی فاروقی، ص ۳۹

عوامی زندگی میں کہاوتوں اور محاوروں کے استعمال کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ان سے عوام کی زندگی کے بہت سے پہلو آشکار ہوتے ہیں۔نظیر نے بھی محاوروں اور کہاوتوں سے کام نکالا ہے۔ان کے استعمال سے اس عہد کے عوام کی ذہنی سطح اور ان کے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔شادی بیاہ کے وقت سماجی رشتوں، زندگی کے دکھ سکھ کا جو Depcition کہاوتوں اور محاوروں کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اجتماعی زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ڈاکٹر یونس اگاسکر نے صحیح لکھا ہے کہ:-

> ''اس ہتھیار کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اکثر کہاوتوں کو سماج کا ایک بڑا طبقہ زندگی کی اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔''(۱)

نظیر نے اپنے عہد کی کہاوتوں اور محاوروں کا اکثر و بیشتر استعمال کیا ہے، جن میں عوام کے رسم و رواج کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً کچھ کہاوتیں یوں ہیں:

اشراف پانو پڑے، کمینہ سر چڑھے

---

(۱) ''اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو''، ڈاکٹر یونس اگاسکر، ص ۵۰

اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں

بڑا آدمی دال کھائے تو سادہ، غریب کھائے تو کنگال

اندھا گائے، بہرا بجائے

بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں

دور کے ڈھول سہانے

جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام

کسان کا بچہ کام نہ کرے تو گھام (دھوپ) مرے

گھر میں نہیں دانے اماں چلیں بھنانے

تھوتھا چنا باجے گھنا

ادھ جل گگری چھلکت جائے

سمدھیانہ اور پائخانہ دور اچھا ہوتا ہے (۱)

اس طرح چند محاورے جن سے عوامی زندگی کا ڈھانچہ سامنے آتا ہے وہ اس طرح ہیں:

---

(۱) بحوالہ: ''اردو میں لوک ادب''، مرتب: پروفیسر قمر رئیس، ص ۲۴۷

ہڈی ڈال کے کتے لڑانا

چونا لگانا

ہتھیلی پر سرسوں جمانا

آگ کھانا انگارے ہگنا

سوکھے دھانوں پانی پڑنا

دانا پانی اٹھنا (۱)

عوام کی زندگی اور ان کے انداز فکر سے نیز ان کی سطح فراست کے مطالعے کے لئے پہیلیوں کی بھی اپنی خاص اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ جنتر منتر، فارمولے، بارہ ماسہ اور اس طرح کی دیگر اصناف عوامی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر بارہ ماسہ کو عوامی زندگی اور کلچر کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ بارہ ماسہ کو شاعری کی صنف میں اس طرح قبول کرلیا گیا ہے کہ اسے باقاعدہ عوامی شاعری کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ عوام کے کلچر میں ہندی مہینوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ شادی بیاہ، رسم و رواج، غم اور خوشی اور روایتوں کو نباہنے کے سلسلے میں

---

(۱) ''اردو کی عوامی روایت چہار بیت کے حوالے سے''، شکیل جہانگیری، ص۶۴، ۶۵

اس صنف سے بہتر عکاسی اور کہیں نہیں ملتی ۔ بقول اظہر علی فاروقی :-

''کویتا اور شاعری میں بارہ ماسہ کہنے کا رواج غالبًا اوائل تیرہویں صدی سے ہوا ہے۔ اور دیوناگری خط میں 'بارہ ناؤں' (بارہ نام) پہلا بارہ ماسہ ملتا ہے۔ جس کو جن دھم سوری نے نظم کیا ہے۔ یہ ایک بڑے سنت کہے جاتے ہیں۔ فارسی رسم الخط میں غالبًا یہ کام امیر خسرو نے کیا ہوگا، لیکن ہمیں اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ملا۔ 'بارہ ناؤں' ساون سے شروع ہوتا ہے اور اساڑھ آخری مہینہ ہے۔ اس قسم کی دوسری چیز دیوناگری خط میں ونے چندسوری نے نیم ناتھ چتش پدکا (Nemnath Chatush Padika) جس کا سن تصنیف ۱۳۵۳ء ہے۔ اس میں بھی آغاز ساون کے مہینے سے اور خاتمہ اساڑھ پر ۱۴۰۰ء کے قریب 'بسیل دیوارسو' میں بھی بارہ ماسہ ملتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر پرکاش مونس نے بارہ ماسہ اور عوامی زندگی کے رابطے کے سلسلے میں تفصیل کے

---

(۱) ''اتر پردیش کے لوک گیت''، اظہر علی فاروقی، ص ۶۹، ۶۸، ۴

ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :-

''بارہ ماسوں کے ضمن میں آن کے عوامی بارہ ماسوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جو آج ہندو گھرانوں میں تہواروں خصوصاً تیجو یا ساون کی ہریالی تیجے کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ان میں لوک گیتوں کی قربت کے باوجود بارہ ماسے کی روایتی شاعری نہایت دل کش انداز میں پوری آب وتاب کے ساتھ نظر نواز ہوتی ہے۔کہیں کہیں تو یہ ادبی حدود چھونے لگتی ہے۔ایسے عوامی بارہ ماسوں میں خیرا شاہ، اللہ بخش اور بینی مادھو کے بارہ ماسے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔''(۱)

نظیر اکبرآبادی نے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور عوامی زندگی کے جو متعدد نقشے پیش کئے ہیں ان میں ان تمام عناصر کی اہمیت ہے۔عوام کا ذہن، جادو، ٹونا، ٹوٹکا، تعویذ، گنڈا، جھاڑ پھونک، ملا، مولوی، پنڈت اور جوگی جیسے عناصر اور طبقوں سے ناگزیر طور پر وابستہ ہے۔نظیر نے انہیں بھی اپنی شاعری کا جزو بنالیا ہے۔غرض تہذیبی رشتے کے جو عناصر ہو سکتے ہیں وہ سب ان کی

(۱)''اردو میں لوک ادب''، مرتب، پروفیسر قمر رئیس، ۴۳

شاعری میں سمٹ آئے ہیں۔ بارہ ماسہ کے سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:-

''بارہ ماسائی شاعری میں اس کی طرف اشارے جگہ جگہ آتے ہیں جن کے ذریعے بارہ ماسوں کی تہذیبی فضا کا رشتہ ہندوستان کے بے شمار محنت کش عوام سے جڑ جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بارہ ماسوں کی زبان مقامی تلفظ اور علاقائی لب ولہجہ لائق توجہ ہے ...... یہ ذخیرہ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے۔ اس کی چھان پھٹک اور اخذ و انتخاب سے ہماری زبان کے تمول میں اضافہ ہوگا۔ اور عوام سے قریب اور حسب ضرورت خود کو عوام سے قریب تر لانے میں یہ طرز ادا اور بات چیت کا یہ انداز جو بارہ ماسوں اور اردو کے عوامی گیتوں اور عوامی ادبیات کے نمونوں میں محفوظ ہے۔ جس طرح ماضی میں ہمارے کام آیا مستقبل میں بھی ہمارے کام آئے گا۔''(۱)

عوامی زندگی جس میں سماجی، ثقافتی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی ملتی ہے۔ نظیر سے

---

(۱) ''اردو میں لوک ادب''، مرتب: پروفیسر قمر رئیس، ص ۸۵

پہلے قلی قطب شاہ ، فائز اور ولی جیسے شعرا کے یہاں بھی مل جاتی ہے ۔فطری مناظر اور عوام الناس کے رسم ورواج میں مذہبی وسماجی تقریبات کے نقوش قلی قطب شاہ کے یہاں بھی موجود ہیں ۔محرم، عید، بقرعید، شب برات ، رمضان ، بسنت ، برسات اوراس ضمن میں سماجی ڈھانچے کی تفصیلات اچھی طرح حاصل ہو جاتی ہے ۔غریبوں اورمحتاجوں کی بھیڑ ، کھانے کی چیزوں اور کپڑوں کی تقسیم ، بسنت وغیرہ کے موقعوں پرتہواروں کا اہتمام اوراس سلسلے میں عوامی کلچر کی پیشکش اگرادب کا ایک اہم حصہ ہےتو تہذیب ومعاشرت کی ایک دستاویز بھی ہے ۔محمد قلی قطب شاہ کی ایک نظم ''عید میلادالنبی'' میں عوامی زندگی پوری طرح منعکس ہے۔ حد یہ ہے کہ عید میلادالنبی کے موقع پر شریک ہونے والوں کے لباس اور وضع قطع اور حسینوں کے ناچ تک کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔بازی گری اور فن کاری جوعوامی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے وہ بھی کہیں نہ کہیں اس نظم میں شریک ہو گئے ہیں ۔نظیرا کبرآبادی سے پہلے صدرالدین فائز دہلوی کی نظم ''تعریف بیان میلا'' میں عوامی زندگی کا ایک پہلو یوں سامنے آتا ہے:

آج بہتے کا یار میلا ہے
خلق کا اس کنار ریلا ہے

مرد و زن سب چلے ہیں اس جا پر

خلق پھیلی کنار دریا پر

ایک جانب ہے بھگتیوں کا ہجوم

خال روشن سے دوبنے ہیں نجوم

ایک جانب میں بھانڈا کا ہے شور

دیکھنا ان کا اہل دل کو ضرور

مسخروں سے ہے گرم سب بازار

ناچتے کودتے ہیں کھاتے پچھاڑ

ایک جانب میں نٹ کا ہنگامہ

فن میں اپنے ہیں سخت علامہ

ڈھول بجتا ہے اس تماشا میں

سب رزالے کھڑے ہیں جاں میں

گبر اور ترسا ، ہندو ، مسلم ساتھ

پھرتے بازار میں پکڑ کر ہاتھ

نظیر نے اس روایت میں توسیع کی ہے اور اپنے عہد اور ماحول کی وسیع تر عکاسی کی ہے۔آل احمد سرور لکھتے ہیں:-

''شہر آشوب میں نظیر نے چھتیس پیشوں کا ذکر کیا ہے۔ان میں سے بعض سے تو اب لوگ شاید ہی آشنا ہوں۔نظیر کے یہاں جہاں خوشحالی کے مرقعے ہیں۔ وہاں عوام کی زبوں حالی کا بھی تذکرہ ہے ۔مگر قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس زبوں حالی کے باوجود یہ لوگ میلوں، تہواروں اور تفریحات میں ہنستے بولتے ہیں اور زندگی سے جتنا ممکن ہے رس نچوڑتے ہیں۔''(۱)

نظیر کے یہاں کہیں کہیں صوفیانہ معاشرت کے نقشے بھی ملتے ہیں اور کچھ لوگوں نے تو اسی بنیاد پر انہیں نشانہ ملامت بھی بنایا ہے۔لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اس دور کی عوامی زندگی کا مکمل نقشہ اس وقت پیش کیا جا سکتا تھا جب ان پہلوؤں کو بھی پیش کیا جائے۔مخمور اکبر آبادی نے صحیح لکھا ہے:-

---

(۱)''نظیر اکبر آبادی: ان کا عہد اور شاعری''، مرتب: شمس الحق، عثمانی، ص ۲۲۱،۲۲۲

''انہوں نے واعظ کے مقام اعلیٰ پر کھڑے ہو کر دنیا کو کبھی نصیحت نہیں کی بلکہ جس طبقے کی فہمائش مقصود ہے اس کے بدترین افراد کے گلوں میں باہیں ڈال کر سمجھایا۔ اور اپنے کو خود انہیں کی جماعت کا ایک انسان قرار دے کر نصیحت کی ہے۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو ناگوار نہیں ہوتا۔ اور سنانے والے کو گوش شنوا میسر آجاتا ہے۔''(۱)

مختصراً اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں اپنی موضوعاتی وحدت اور وسعت کے باوجود احساس تعمیر اور خیال وتاثر کی منزل بہ منزل تشکیل اور انداز اظہار سے بھرپور ہیں۔ اس طرح نظیر اپنے عہد کے بڑے شاعر تو ہیں ہی اپنے عہد سے آگے نکل کر ان کی حیثیت آفاقیت کا مظہر بھی ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر محمد حسن اور اس معیار کے دوسرے اہم ناقدین کا خیال ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ایسی ہیں کہ انہیں دور قدیم کا سب

---

(۱) ''نظیر اور انسان''، مخمور اکبرآبادی، مطبوعہ: ''کلیم'' دہلی، مئی ۱۹۳۸ء، ص ۴۲۲

سے بڑا نظم گو قرار دینا مبالغہ نہ ہوگا، کیوں کہ وہ دور جدید میں بھی اقبال اور چند دیگر شعرا کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ان کا مقابل نکل سکے۔

بعض ناقدین نے نظیر کو دوسرے درجے کا شاعر لکھا اور سمجھا ہے۔ ایسے لوگوں کا بیان ہے کہ نظیر کی شاعری اوباش، آوارہ، بداطوار لوگوں کے مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ ان کے یہاں فحش، عامیانہ، رکیک اور مبتذل انداز کی شاعری ملتی ہے۔ لیکن میرے خیال سے اس قسم کے خیالات اور آرا سے نظیر اکبرآبادی کے مقام و مرتبہ پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے۔ نظیر اپنے انداز سے کل بھی بڑے شاعر تھے اور آج بھی ہیں۔

000

# باب دوم

# نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی قسمیں

گذشتہ باب میں نظیر اکبر آبادی کے عہد سے گفتگو کی گئی۔ زیر نظر باب نظیر کی نظموں کی قسموں کے مطالعے پر مبنی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت پہلے ہی کرتا چلوں کہ نظیر کے پاس انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام تر مسائل وموضوعات اور تجربات ومشاہدات موجود تھے اور انہوں نے اپنی شاعری میں ان تمام مسائل وموضوعات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظیر نے اپنے گہرے مشاہدے کے ذریعہ مختلف طبقوں کے سماجی حالات ومسائل کا مطالعہ کیا تھا اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری سماجی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ نظیر کی شاعری ہماری تہذیبی زندگی کی ایک اہم اور ضخیم دستاویز تیار کرتی ہے۔ ایک ایسی دستاویز جس میں مختلف موضوعات، محسوسات اور متعدد نقش ورنگ منعکس نظر آتے ہیں۔ اگر ہم نظیر اکبر آبادی کے پورے سرمایہ سخن کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو ہمیں مختلف موضوعات سے متعلق ان کی منظومات کے مطالعے کا موقع مل سکتا ہے۔ چنانچہ نظیر کی نظموں کی تقسیم موضوعات

اور مسائل ،محسوسات اور مشاہدات نیز تجربات کے اعتبار سے مندرجہ ذیل خانوں میں کی جاسکتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی کلیات میں بعض نظمیں ایسی ملتی ہیں جن کا تعلق حمد، نعت ،منقبت اور مدحیہ شاعری سے ہے۔ایسی نظموں میں ''نظیر محراب عبادت میں''، ''اے برتر از خیال و قیاس وگمان ما''، ''ہواللہ خالق الباری''، ''تو کار جہاں رانکوساختی''، ''نظیر بارگاہ رسالت میں''، ''حضرت علی کا معجزہ''، ''خیبر کی لڑائی''، ''مناقب شیر خدا''، ''زور بازوئے علی''، ''مدح پنجتن''، ''مدح پنجتن پاک''، ''ثمرۂ عقیدت''، ''نظیر روضہ حضرت سلیم چشتی پر''، ''نذر حضرت گرو گنج بخش'' اور ''نذر گرونا نک شاہ'' وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کا تعلق چونکہ شہر آگرہ سے تھا اس لئے ان کے یہاں آگرہ خصوصاً اکبر آباد کے حوالے سے بھی متعدد اہم نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔جیسے ''عیدگاہ اکبر آباد''، ''شہر اکبر آباد''، ''آگرے کی تیراکی''، ''آگرے کی ککڑی''، ''تاج گنج کا روضہ'' وغیرہ نظموں کے علاوہ آگرے کے کھیل تماشوں کا بھی ان کی نظموں میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔نظیر نے شہر آگرہ کی سماجی، علمی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کے پیش نظر ایک معرکہ آرا نظم ''شہر آشوب'' بھی تخلیق کی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی کلیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کیں اپنے تجربات اور مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے عمر کے مختلف مدارج پر بھی عمدہ اور کامیاب نظمیں قلمبند کی ہیں۔ایسی نظموں میں ''طفلی''،''لطف شباب''،''عالم پیری''، ''بڑھاپے کی تعلیاں''،''بڑھاپے کا عشق''،''جوانی بڑھاپے کی لڑائی''،''موازنۂ زورو کمزوری'' ''موت کی فلاسفی''،''کل نفس ذائقة الموت''،''کل من علیهافان''،''کل شئی هالک''، ''فنا'' وغیرہ نہایت پراثر اور کامیاب نظمیں ہیں۔

نظیر کے یہاں فنا اور بقا کا بھی ایک خاص انداز سے ذکر ملتا ہے۔ظاہر ہے ہر آدمی جانتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔انسان خاک کا پتلا ہے اور آخر کار اس کو ایک دن خاک میں مل جانا ہے۔چنانچہ نظیر کے یہاں اس سلسلے کی نظموں میں ''فنا''،''بعد از فنا''،''سفر آخرت کی تیاری'' اور ''بنجارا'' وغیرہ نہایت اہم نظمیں ہیں۔

نظیر نے اپنی نظموں میں اگر ایک طرف نہایت تزک واحتشام سے تقریبات اہل اسلام کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف اسی شان وشوکت اور عزت واحترام نیز عقیدت کے ساتھ تقریبات اہل ہنود کا بھی ذکر کیا ہے۔تقریبات اہل اسلام کے حوالے سے نظیر کی چند مشہور نظموں میں اگر ''شب برات'' اور ''عیدالفطر'' ہیں تو اہل ہنود کی تقریبات کے حوالے سے ان کی

مشہور نظموں میں ''بسنت'' ''ہولی''، ''ہولی کی بہاریں''، ''دوالی'' ''دیوالی کا سماں''، ''راکھی''، ''کنہیا جی کا راس''، ''بلدیو جی کا میلا'' وغیرہ قیمتی نظمیں ہیں۔

اسی طرح اخلاقیات کے حوالے سے نظیر کے یہاں متعدد اہم اور قابل ذکر نظمیں ملتی ہیں۔ ان اہم اور قابل ذکر نظموں میں ''مذمت دنیا''، ''مذمت اہل دنیا''، ''مکافات عمل''، ''دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے''، ''دنیا دارالمکافاۃ ہے'' (یہ نظم ''کلجگ'' کے عنوان سے زیادہ مقبول ہے)، ''صدائے درویش''، ''تسلیم و رضا'' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے یہاں بعض فلسفیانہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے ''کوڑی کی فلاسفی''، ''روپے کی فلاسفی''، ''زر کی فلاسفی''، ''مفلسی کی فلاسفی''، ''آٹے دال کی فلاسفی''، ''روٹی کی فلاسفی''، ''چپاتی کی فلاسفی''، ''پیٹ کی فلاسفی''، ''تندرستی کی فلاسفی''، ''خوشامد کی فلاسفی''، ''آدمی کی فلاسفی'' وغیرہ جیسی طویل طویل اور عمدہ و کامیاب نظمیں کلیات نظیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ نظیر کے یہاں کچھ ظریفانہ نظمیں بھی ملتی ہیں اور کچھ ایسی نظمیں ہیں جو محض تفنن طبع کی خاطر قلمبند کی گئی ہیں۔

اجمالی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نظیر کے یہاں ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں کہیں عوام دوستی کے نقوش ابھارے گئے ہیں تو کہیں انسانی ہمدردی کے موضوعات پیش ہوئے

ہیں۔بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں ہندوستانی لوک کلچر کے نقوش نظر آتے ہیں تو بعض نظموں میں فطرت کی متنوع اور رنگارنگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔اس قسم کی نظموں میں ہندو اور مسلمان دونوں کے تہواروں، میلوں ٹھیلوں، کے علاوہ موسم سے متعلق نظمیں اہم ہیں۔اس زمرے کی نظموں میں برسات سے متعلق نظمیں، جاڑے کی بہاروں سے متعلق نظمیں وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ نظیر کے یہاں ایسی منظومات بھی پائی جاتی ہیں جن میں نظیر کا صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ ایسی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشی، سادگی اور رواداری، امن اور شانتی کے جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور جزا اور سزا کے نکتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ہندو کلچر اور معتقدات کی ترجمانی کی گئی ہے۔اپنی نظموں میں نظیر ان موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن میں پند و نصیحت کا عنصر بیش از بیش نظر آتا ہے۔ایسی نظموں میں نظیر ایک ناصح کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔مگر ایسی نظموں میں خاص طور پر فکری اور فلسفیانہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔

غرض جب ہم نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی مندرجہ بالا قسموں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس

روشنی میں نظیر کے شاعرانہ تخلیقی کمالات مزید روشن ہوکر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

نظیر کی شاعری کا سب سے روشن اور تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے انسانیت دوستی اور انسان نوازی کے جذبات کی ترویج واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ مختلف موضوعات کے تحت ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ نظیر کا مرکزی موضوع انسان دوستی اور انسایت نوازی ہے۔ اس بنیادی موضوع کو انہوں نے ہندوستان کے کلچر کے تناظر میں پیش کیا ہے تو کبھی فطرت کے، کہیں ہندوستانی معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور کہیں طبقاتی کشاکش بیان کرتے ہوئے۔ چنانچہ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے اپنی کتاب ''نقوش وافکار'' میں نظیر کی انسانیت دوستی کے سلسلے میں تفصیلی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنے بیان میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

> ''نظیر کے کلام کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک خوش دل اور شگفتہ مزاج رفیق مل گیا ہے جس کو انسان اور انسانی دنیا سے محبت ہے۔ جو انسان کی بے قدری نہیں کرتا۔ جو انسانی زندگی کی کم مائیگی کا احساس پیدا کر کے دلوں کو افسردہ نہیں کرتا۔ جو اپنی رفاقت سے ہمارے اندر ایک تقویت پیدا کرتا ہے اور ہم کو یہ اطمینان دلاتا ہے

زندگی صرف دکھ درد کا نام نہیں ہے۔''(۱)

ایسا نہیں ہے کہ انسان دوستی کے محسوسات پر اصرار کرتے ہوئے نظیر کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بظاہر نصیحت انسان کو اچھائیوں کو قبول کرنے میں بھی مانع بن جاتی ہے۔ اس لئے نظیر نے ایسے خیالات بہ انداز دگر پیش کئے ہیں اور مختلف تمثیلوں یا واقعات کی تفصیل کے ذریعہ انسانی ہمدردی کے خفتہ جذبات کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر شہباز ''زندگانی بے نظیر'' میں اپنے مخصوص انداز میں نظیر کی اس خصوصیت کو ان کا مقصد اعظم بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''میرے خیال میں اردو کے شعرا میں شاید ہی کسی کو انسانی طبیعت کا اس قدر صحیح و عمیق تجربہ ہو جتنا کہ اس کی ہر نظم سے پایا جاتا ہے۔ اس کی دن رات اس کام کے لئے آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور وہ دن رات انسان کا ہی تماشا دیکھا کرتا تھا۔ اور انسان کے حالات جاننے کو ہی مقصد اعظم جانتا تھا۔''(۲)

---

(۱)''اردو شاعری میں واقعیت اور جمہوریت کا آغاز''، مجنوں گورکھپوری، مشمولہ: ''نقوش و افکار''، ص ۲۳۹

(۲)''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ۲۴۹

نظیر اکبرآبادی کی انسانیت دوستی صرف ان کے موضوعات تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ خصوصیت ان کی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بن گئی تھی۔ انسانی ہمدردی کے متواتر اظہار کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ان کے انتقال پر جہاں مسلمان اپنے انداز سے اظہار غم کر رہے تھے وہاں ہندو حضرات بھی خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے پریشان تھے۔ شہباز نے اس صورت حال کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:-

> ''میاں نظیر جب مر گئے تو ہندو شاگردوں نے چاہا کے اپنے طور پر ان کی موت پر اظہار تاسف کریں۔ نظیر کے خاندان کے لوگوں نے کچھ مخالفت کرنی چاہی تو ان ہندوؤں نے کہا کہ اگر مخالفت کرو گے تو گرونانک شاہ کا حال ہوگا کہ نصف چادر مسلمانوں نے دفن کی تھی اور نصف جلائی گئی تھی۔ اس تقریر پر وارثوں نے تعرض چھوڑ دیا اور ان کو اپنے طور پر مرحوم نظیر کی صلح کل کا خراج ادا کرنے دیا۔''(۱)

(۱)''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ۱۳۹

نظیر کی نظمیں ''بنجارہ نامہ''، ''کلجگ''، ''جوگی نامہ'' بظاہر صوفیانہ وضع کی حامل نظمیں ہیں لیکن دیکھا جائے تو ان میں بھی انسانی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنی نظم ''بنجارہ نامہ'' میں یہ کہتے ہیں کہ:

ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئنیں، پلا سر بھارا

کیا گیہوں، چاول، سونٹھ، مٹر، کیا آگ، دھواں، کیا انگارا

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ دنیا کے حرص وہوا کو چھوڑ کر بھی انسان اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اجل کا قزاق دن رات اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ دنیا کی ساری نعمتیں اور ساری سہولتیں آنکھ بند کرتے ہی دور ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ انسان کی فلاح کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت میں زیادہ سے زیادہ خوبیاں داخل کرے۔ اس طرح دیکھا جائے تو نظم ''بنجارہ نامہ''، ''کلجگ''، ''فقیروں کی صدا''، ''پناہ نامہ''، ''جوگی نامہ'' اور ''روٹی نامہ'' جیسی تخلیقات میں بھی نظیر کی انسانیت دوستی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان

نظموں کے مندرجہ ذیل ایک ایک اقتباس سے اس دعوے کی دلیل مہیا ہوتی ہے:

بنجارہ نامہ:

ٹک حرص وہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئنیں، پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، سونٹھ، مٹر، کیا آگ، دھواں، کیا انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کلجگ:

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا، میوہ لے، پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

فقیروں کی صدا:

ہٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے بے بس من مار مرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب کوچ نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

فنا نامہ:

حسن و جمال پاکر ، جو خوب رو کہایا
یا عشق میں کسی نے ، جی جان کو گھٹایا
آکر پڑا سروں پر، جس دم اجل کا سایا
دونوں میں پھر کسی کو ، ڈھونڈا کہیں نہ پایا
عاشق ہوا تو پھر کیا ، دلبر ہوا تو پھر کیا

جوگی نامہ:

اب جو مل جائے کہیں وہ تو یہ ہم اس سے کہیں
کب تلک درد جدائی کو بھلا تیرے سہیں
اتنا بھی بس نہیں اے یار کہ ہم مر ہی رہیں
دور جس دن سے ہوا تجھ چمن حسن سے میں
نہ مجھے باغ خوش آتا ہے نہ گلشن نہ چمن

روٹی نامہ:

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پر ی رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب دکھاتی ہیں روٹیاں

نظیر کی انسانیت دوستی انسانی معاشرے کے کسی مخصوص طبقے تک محدود نہیں۔ وہ صوفیانہ مزاج کے حامل تھے اور انسانوں کو کسی جماعت یا طبقے میں منقسم کر کے دیکھنے کے قائل

نہیں تھے۔انسانی جذبات ومحسوسات کی شدت چاہے وہ کسی طبقے میں ہونظیر کے لئے اہمیت کے حامل تھی۔ان کا مذہب انسانیت تھااور انسان کے جذبات و کیفیات کو پیش کر دینا ان کا مقصد سخن تھا۔چنانچہ اگرایک طرف مذہب اسلام کے عقائداوراس جماعت کے تصورات نے ان کے اندر تخلیقی تحریک پیدا کی ہےتو دوسری طرف کنہیا جی، ہولی، دیوالی، بسنت، راکھی اور بلدیو جی کا میلہ میں ایسے مست و بے خود ہونے والے انسانوں کے جذبات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔نسبی طور پر مسلمان ہونے کا حق تو بہت سے مسلمان شعرا نے اس طرح ادا کیا ہے کہ انہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کی ترجمانی کی ہےاور انداز بدل بدل کر مختلف اصناف سخن میں اپنے مذہب کی حمایت کی ۔لیکن نظیر کا دل سب کے لئے کھلا ہوا تھا۔غیر مسلموں کے دکھ سکھ اوران کے تہواروں سے بھی ان کا وہی جذباتی تعلق تھا جو مسلمانوں کے سلسلے میں تھا۔ اس وسیع القلبی کا مظاہرہ نظیر کے علاوہ اردو شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے۔اور ایسا بھی نہیں کہ انہوں نے صرف موضوع کو شاعری میں پرونے کے لئے ہندوؤں کے تہواروں کو نظم کیا ہے بلکہ بڑی بات یہ ہے کہ ایسی تمام منظومات میں ان کا زبردست تخلیقی انہاک نظر آتا ہے ۔ان کی نظموں کے مصرعے اور مختلف بند اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے ان موضوعات کو بھی پوری جذباتی دلچسپی کے ساتھ نظم کیا ہے۔یہ سر مستی ،سرشاری اور ماضی سے

گہری جذباتی وابستگی نظیر کی افتادطبع ظاہر کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار بسنت کی خوشی انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں نظم کی ہے۔اسی سرمستی اور بےخودی کی عکاسی خاص طور پر نظم کے ان دو بندوں سے ہوتی ہے:

تھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار
اور یار کے گجرے بھی تھے اک دھون کی مقدار
آنکھوں میں نشے مئے کے ابلتے تھے دھواں
دھار جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار
سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا

پگڑی میں ہماری تھے جو گیندوں کے کئی پیڑ
ہر جھونک میں لگتی تھی بسنتوں کے تئیں ایڑ
ساقی نے بھی مٹکے سے دیا منہ کے تئیں بھیڑ
ہر بات میں ہوتی تھی اسی بات کی آچھیڑ
سب کی تو بسنتیں ہیں کہ یاروں کا بسنتا

کہیں بھی ایسانہیں لگتا کہ نظیراکبرآبادی صرف اکثریتی فرقے کی خوشیوں اورتہواروں

کا ذکر ان کے اطمینان اور مسرت کے لئے کر رہے ہیں۔ بلکہ ان تمام موقعوں پر نظیر کی ذاتی دلچسپی اور ان کی شخصیت کی شمولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مکمل Involvement اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ نظیر نے اپنے موضوعات کو تاریخی سطح پر نہیں برتا ہے بلکہ انہیں اپنی شخصیت اور اپنے جذبات و محسوسات کا ایک حصہ بنالیا ہے۔ نظم ہولی میں ایک جگہ کہتے ہیں:

ادھر سے رنگ لئے آؤ تم ادھر سے ہم
گلال عبیر ملیں منہ پہ ہو کے خوش ہر دم
خوشی سے بولیں ہنسیں ہولی کھیل کر باہم
بہت دنوں سے ہمیں تو تمہارے سر کی قسم
اسی امید میں تھا انتظار ہولی کا

بتوں کی گالیاں ہنس ہنس کے کوئی سہتا ہے
گلال پڑتا ہے کپڑوں سے رنگ بہتا ہے
لگا کے تاک کوئی منہ کو دیکھ رہتا ہے
نظیر یار سے اپنے کھڑا یہ کہتا ہے
مزا دکھا ہمیں کچھ تو بھی یار ہولی کا

اسی طرح نظیر نے ''راکھی'' اور ''بلدیو جی کا میلہ'' جیسی نظموں میں بھی اپنے کشادہ ذہن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس میں انسانی جماعت کو بغیر کسی تفریق کے ایک سمجھ کر انہوں نے عام انسانی محبت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

تو ایسا لگتا ہے کہ وہ راکھی کو ہندوؤں کا تہوار اور رسم نہیں سمجھتے بلکہ اپنی معاشرت کا ایک خوشگوار حصہ محسوس کرتے ہیں۔ نظم ''راکھی'' میں اس رسم سے ذہنی و قلبی لگاؤ کے ساتھ ان کا روحانی انداز بھی عیاں رہتا ہے۔ کہتے ہیں:

ادا سے ہاتھ اٹھتے ہیں گل راکھی جو ہلتے ہیں
کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہنچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں
چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے مارے
تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے تارے

پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اپر بارے

نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے

بندھالواس سے اب ہنس کرتم اس تہوار کی راکھی

نظیر کے یہاں انسانی ہمدردی کئی جہتوں سے آشکار ہوتی ہے۔مختلف انسانی معاشرے کے طور طریقوں کی طرف بھی ان کا رجحان رہتا ہے۔وہ جانتے ہیں کہ مختلف انسانی طبقے الگ الگ رسم ورواج اور طور طریقہ زندگی کے حامل ہیں۔عصبیت سے خالی ان کا دل عوام الناس کے ہر شغل سے دلچسپی رکھتا ہے۔کوئی بلبلوں کی لڑائی یا کبوتر بازی سے خوش ہوتا ہے تو نظیر بھی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔کوئی گلہری کا بچہ یا اژدہے کے بچے کا تماشہ دکھا کر لوگوں کو مسرور کرتا ہے تو نظیر بھی اس کی خوشی میں شریک ہو جاتے ہیں۔غرض ہر طبقے کے جذبات کے ساتھ نظیر کا جذباتی تعلق قائم ہو جاتا ہے اور یہ جذباتی تعلق ان کی منظومات کی روانی اور وارفتگی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔نظم ''کبوتر بازی'' میں اظہار کی وارفتگی کا یہ انداز ملاحظہ ہو:

کیا بلبل و قمری و چھے پدڑی و پدے

چنڈول ، اگن ، لال ، بئے ، ابلقے، طوطے

کیا طوطی و مینا و پپئی، تیتر و شکرے

طائر ہیں غرض بازی اشغال کے جتنے

کی غور تو ہیں سب سے سر افراز کبوتر

لقے ہیں ادھر اپنی کساوٹ کو دکھاتے

چینے ہیں ادھر سیم بری اپنی جتاتے

ہیں جو گیے بھی رنگ گئی جوگ کے لاتے

پریوں کے پرے دیکھ کے ہیں چرخ میں آتے

جب حلقہ زناں کرتے ہیں پرواز کبوتر

اسی طرح کبوتر کی لڑائی کی منظر کشی نظیر نے کئی جگہ مختلف انداز سے کی ہے۔اور جہاں جہاں ایسی منظر کشی کی گئی ہے وہاں بھی عام انسانوں کے محسوسات سے جذباتی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ایک جگہ کہتے ہیں:

تھی تین کی یہ کشتی چوتھی کو اس نے چھوڑا

اس نے تو خم بجا کر تینوں کو دھر جھنجھوڑا

پھر تو یہ پھٹکا آکر ان کشتیوں کا کوڑا

چھوٹا کسی کا ہاتھی بھاگا کسی کا گھوڑا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں

اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

اک کنکری جو ماری پڑھ ہم نے پھر فسوں کی

کشتی میں گٹھری بندھ گئی ان چاروں بلبلوں کی

سن سن کے چیخیں ان کی لڑنے میں غٹرغوں کی

سب بولے واہ حضرت اچھی یہ پڑھ کے پھونکی

سوسوطرح کے دھومیں اک دم میں کر دکھائیں

اس ڈھب سے ہم نے یاروکل بلبلیں لڑائیں

ان بندوں میں نہ صرف انسانی معاشرے کے سلسلے میں کھلے دل سے اپنی شخصیت کی شرکت کا احساس ہوتا ہے بلکہ نظیر کی تخلیقی ہنرمندی کا بھی اس طرح پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے منظر و ماحول کو اپنے تمام جذبات کے ساتھ متحرک بنا کر پیش کیا ہے۔ ریچھ کے بچے کو دیکھ کر انسان کے بچے تو کیا بڑے بھی خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔ جب بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں ریچھ اور ریچھ کا بچہ آتا ہے تو ہر خواص و عام اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ نظیر نے اس منظر کی عکاسی اس طرح کی ہے:

اک طرف کو تھیں سینکڑوں لڑکوں کی پکاریں

اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں

کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی قطاریں

غل، شور ، مزے ، بھیڑ، ٹھٹھ ، انبوہ ، بہاریں

جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر

وہ کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بندر

ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر

ہاں چھوڑ دیا بابا انہیں جنگلے کے اندر

جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

مدت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا

لڑنے کے سوا ناچ بھی اس کو ہے سکھایا

یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا

اس ڈھب سے اسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا

جو سب کی نگاہوں میں کھپا ریچھ کا بچہ

یہ نظیر کی شاعری کا مختلف رنگ ہے جو ایک نگاہ میں سامنے آجاتا ہے۔زیر نظر باب دراصل نظیر کی نظموں کی قسموں پر مبنی ہے۔اب آیئے ذیل میں نظیر کی نظموں کی قسموں کا باضابطہ حال دیکھا جائے اور تبصرہ وتنقید کی منزلوں سے گزرا جائے۔

نظیر اکبرآبادی آسمان ادب کے وہ تنہا اور درخشندہ ستارہ ہیں جنہوں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ساری زندگی تعلیم وتعلم میں گزاری۔اپنے عہد کے نوابوں کے بچوں کی اتالیقی کے علاوہ اپنے شہر اور آس پاس کے علاقوں کی سیر کرتے رہے۔میلوں ٹھیلوں میں آتے جاتے رہے اور یہیں سے اپنی شاعری کے لئے مواد بھی اخذ کیا۔ان کی شاعری پر فارسی کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ اردو سے زیادہ فارسی لکھنے پڑھنے اور بولنے میں مہارت رکھتے تھے۔تذکرہ نویسوں نے اور ناقدین کرام نے لکھا ہے کہ نظیر فطری شاعر ہیں۔ناسخ،غالب اور آتش کی طرح ان کو بھی زور کلام،زور فکر اور جودت طبع نے شاہراہ سخن میں راہنما بنایا۔نظیر کا انداز سب سے جدا ہے۔اس وقت نظیر کا طرز شاعری یا اسلوب مرغوب خاص وعام نہ تھا اور کوئی ان کے رنگ میں کہنے والا بھی نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ان کے زمانے میں نظر انداز کیا گیا اور ان کے انتقال کے

بعد بھی ایک عرصے تک یہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ نظیر اپنے انداز خاص کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اپنے لگائے ہوئے پودے کی عمر بھر انہوں نے خود آبیاری کی اور کسی دوسرے کے احسان سے گراں بار ہونا گوارا نہیں کیا۔

میں نے گذشتہ صفحات میں نظیر کی نظموں کی جو تقسیم اپنے انداز سے کی ہے، اس میں اول درجے میں نظیر کے ویسے کلام کو رکھا ہے جس میں حمد، نعت، منقبت اور مدحیہ کلام کا شمار ہونا چاہئے۔ ''کلیات نظیر'' جسے مولانا عبدالباری آسی نے مرتب و مدون کیا ہے اور جو نول کشور پریس لکھنؤ سے جون ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے، اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ یہ کلیات ۹۶۰ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں عبدالباری آسی صاحب نے نظیر کے کلام کی جو درجہ بندی کی ہے اس میں سب سے پہلے غزلوں کا سلسلہ ہے۔ اس کے بعد مخمسات، خمسہ اورواسوخت کا ذکر ہے۔ پھر مسدس، ترجیع بند، قصائد، قطعات اور رباعیات کا سلسلہ ہے۔ اس کے بعد نظیر کی مثنویاں زیر بحث آئی ہیں۔ اس کے بعد نظمیات نظیر ہیں۔ یہاں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ میرا موضوع نظیر کی غزلیں نہیں ہیں۔ مجھے نظیر کی نظموں کے حوالے سے اپنا یہ تحقیقی مقالہ پیش کرنا ہے اور زیر نظر باب نظیر کی نظموں کی قسموں سے متعلق ہے۔ پہلی نظم ''نظیر محراب عبادت میں'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس کے علاوہ نظیر اکبرآبادی کی کلیات

میں ''اے برتر از خیال وقیاس وگمان ما''، ''ھواللہ خالق الباری''، ''تو کارجہاں رانکوساختی''، ''نظیر بارگاہ رسالت میں''، ''حضرت علی کا معجزہ''، ''خیبر کا معجزہ''، ''مناقب شیر خدا''، ''زور بازوئے علی''، ''مدح پنجتن''، ''مدح پنجتن پاک''، ''ثمرۂ عقیدت''، ''نظیر روضہ حضرت سلیم چشتی پر''، ''نذر حضرت گرو گنج بخش'' اور ''نذر گرونانک شاہ'' وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔ میں یہاں مدحیہ کلام کا نمونہ پیش کرنے کے لئے سب سے پہلی نظم یعنی ''نظیر محراب عبادت میں'' سے دو چار بند پیش کر رہا ہوں:

الٰہی تو غفار ہے اور رحیم      الٰہی تو فیاض ہے اور کریم
نہ تیرا شریک اور نہ ترا سہیم      مقدس، معلّٰی، منزہ، عظیم
تری ذات والا ہے یکتا قدیم

کئے ہیں جہاں میں وہ نقش و نگار      ترے حسن قدرت نے یا کردگار
تحیر میں ہے دیکھ کر بار بار      پہنچتی نہیں عقل انہیں ذرہ وار
ہیں جتنے جہاں میں ذہین و فہیم

نجوم ان میں کیا کیا درخشاں کئے      زمیں پر سمٰوات گرداں کئے
عیاں بحر سے در و مرجاں کئے      نباتات بے حد نمایاں کئے

حجر سے جواہر بھی اور زر و سیم

ترا شکر احساں ہو کس سے ادا　　ہمیں مہر سے تو نے پیدا کیا

کئے اور الطاف بے انتہا　　نظیر اس سوا کیا کہے سر جھکا

یہ سب تیرے اکرام ہیں یا کریم

اسی طرح نظیر کی ایک مشہور نعت ''نظیر بارگاہ رسالت میں'' ہے۔ یہ نعت بھی نہایت اہم اور مشہور ہے اور دس بندوں پر مشتمل ہے ۔ یہاں میں بطور نمونہ صرف چند بند نقل کرر ہا ہوں:

تم شہ دنیا و دیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ　　سر گروہ مسلمیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

حاکم دین متیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ　　قبلہ اہل یقیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

رحمتہ للعالمیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

تم ظہور اولیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ　　ہمدم جاں آفریں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

وجہ قرآن مبیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ　　نزہت بستان دیں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

زینت خلد بریں ہو یا محمد مصطفیٰؐ

آپکا فضل و کرم کونین میں مشہور ہے　　اور تمہیں ہر طور سے لطف و کرم منظور ہے

حشر میں گر چہ سزا ملنے کا بھی دستور ہے      کیا ہوا لیکن دل اس امید سے مسرور ہے

تم شفیع المذنبیں ہو یا محمد مصطفےٰؐ

مخبر صادق ہو تم اور حضرت خیر الورا      سرور ہر دو سرا اور شافع روز جزا

ہے تمہاری ذات والا منبع لطف و عطا      کیا نظیر اک اور بھی سب کی مدد کا آسرا

یاں بھی تم واں بھی تمہیں ہو یا محمد مصطفےٰؐ

حمد یہ اور نعتیہ اشعار کے مطالعے سے نظیر کی دربار خداوندی اور بارگاہ رسالت سے سچی اور گہری وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار اس قدر سہل اور آسان ہیں کہ تھوڑی سی مشق سے بچوں کو یاد کرائے جاسکتے ہیں۔ مگر نظیر فہمی کی کمی کے سبب یہ اشعار صرف کلیات نظیر کے اوراق کی زینت ہیں۔

نظیر اکبرآبادی نے حضرت علی کی شان میں بھی کئی نظمیں کہیں ہیں جیسے ''حضرت علی کا معجزہ''، ''خیبر کی لڑائی''، ''مناقب شیر خدا''، ''زور بازوئے علی'' وغیرہ نظمیں کلیات نظیر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''حضرت علی کا معجزہ'' میں شاعر نے ایک واقعے کا بیان کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک بادشاہ زادہ شکار کے لئے ایک روز جنگل گیا۔ جنگل میں اسے ایک شیرنی اپنے بچوں کو دودھ پلاتی نظر آئی۔ بادشاہ زادہ بچوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے بندوق چلادی۔

بندوق کی آواز سن کر نر اور مادہ بھاگ گئے اور بچے اکیلے رہ گئے۔ بادشاہ زادہ دونوں بچوں کو لے کر اپنے محل لوٹ آیا۔ جب بعد میں شیر اور شیرنی نے اپنے بچوں کو اپنے پاس نہیں دیکھا تو شیرنی سر پیٹتی ہوئی غمگین وسوگوار نجف اشرف کی طرف روانہ ہوئی اور فریادی بن کر ساقی کوثر کے سامنے زار زار رونے لگی۔ لوگوں نے جب اس کا حال زار دیکھا تو سب دم بخود رہ گئے۔ لوگوں نے شیرنی کو کھانا پانی سب مہیا کیا لیکن سوائے رونے کے اسے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ آخر کار ایسا ہوا کہ اس شاہزادے نے خواب دیکھا اور اسے ایک قسم کی بے کلی کا احساس ہوا۔ خواب میں یہ کہا گیا تھا کہ تو شیرنی کے بچوں کو جلد کل سویرے نجف اشرف بھجوا دے ورنہ تو اپنے اس گناہ سے بہت شرمسار ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا اور دوسرے دن شیرنی کو اس کے بچے مل گئے۔ نظم کے آخر کے یہ چار بند دیکھئے:

جب اس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شادماں
بچوں سمیت اٹھ کے وہ حیوان بے زباں
روضے کے سات بار تصدق ہوئی وہاں
پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں
جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہو کے ایک بار

شیر خدا کے عدل کی یہ دیکھ رسم و راہ
خلقت تمام واں کی پکاری یہ واہ واہ
انصاف ایسا چاہئے اے شاہ دیں پناہ
حامی و منصف اور نہیں کوئی تم سا شاہ
ہے ختم تم پہ عدل و حمایت کا کاروبار

حیواں تمہارے لطف سے جس وقت ہوویں شاد
انساں پھر مکاں سے رہیں کیوں کہ نامراد
جیسے تمہارے در سے ملی شیرنی کی داد
احسان ایسے ایسے بہت اے کرم نہاد
ہیں گے تمہارے صفحۂ عالم میں یادگار

اے شاہ یہ نظیر تمہارا غلام ہے
رکھتا سوا تمہارے کسی سے نہ کام ہے
عاصی ہے پر گناہ ہے اور ناتمام ہے
دن رات اس کا آپ سے اب یہ کلام ہے

رکھ لیجو میری آبرو یا شاہ کردگار

مذاہب اور معتقدات پر نظیر کی لکھی ہوئی نظموں کا تعلق ان کے مسلک سے کہیں نہ کہیں سے جڑا ہوا ہے۔اس لئے مناسب ہے کہ یہاں ان کے مسلک پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔

نظیر کی زندگی کے ابتدائی زمانے کا عالم یہ تھا کہ ہندوستان کی فضا رومی، عطار، حافظ، تلسی اور کبیر جیسے صوفی شعرا کے نغموں سے معمور تھی۔ان سبھی شعرا نے اپنے اپنے زمانے میں بڑے بڑے انقلابات دیکھے تھے اور مذہبی رہنماؤں کی بے راہ روی کا مشاہدہ کیا تھا۔مذہب کو محاسن سے ایک حد تک خالی اور معائب سے پر پایا تھا۔اس لئے انہوں نے ساری انسانی برادری کو تصوف کے ذریعہ محبت اور رواداری کا سبق دیا تھا۔چنانچہ اردو شاعری جو کئی جہتوں سے فارسی و ہندی شاعری سے متاثر ہے اس لحاظ سے بھی ان کا اثر لئے بغیر نہ رہ سکی۔چونکہ نظیر اردو، فارسی اور ہندی تمام زبانوں کے شعرا کے کلام سے استفادہ کر چکے تھے اس لئے ان کے دل و دماغ پر ان شعرا کے خیالات کی گہری چھاپ پڑ چکی تھی۔ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کی کمزوری اور افراتفری کے سبب انسانی زندگی کی بے بضاعتی نے بھی نظیر کو انسانوں کا بہت بڑا ہمدرد بنا دیا تھا۔اس لئے وہ ان حالات کی روشنی میں انسانی اخوت اور مساوات کے مبلغ بن گئے اور مذاہب کے اختلافات کو ایک حقیقت پسند انسان کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ان کے

خیال میں دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی سچائی تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔راستے کئی ہوسکتے ہیں لیکن سچائی ایک ہی ہے، جہاں آخرکار سب گھوم پھر کر آ پہنچتے ہیں۔اس لئے نظیر راہوں کے اختلاف کے سبب راہروؤں سے منافرت کے خلاف رہے۔اپنی نظم ''رہے نام اللہ کا'' میں نظیر نے اپنے اس عقیدے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

دنیا میں کوئی خاص نہ کوئی عام رہے گا
نہ صاحب مقدور نہ ناکام رہے گا
زردار، نہ بے زر، نہ بدانجام رہے گا
شادی نہ غم گردش ایام رہے گا
نہ عیش ، نہ دکھ درد ، نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں

نہ رند نہ عابد نہ مے آشام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر اختلاف مذاہب کو آفاقی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور محبت ہی کو روح مذہب مانتے تھے۔ مذہب محبت کی تعلیم دینے والے شعرا نے اکثر و بیشتر اپنے کلام کو پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا میں صوفیانہ شاعری کا ایک بہت بڑا خزانہ جمع ہوگیا ہے۔ جس کے طفیل مذہب محبت یعنی آفاقی مذہب کی حیثیت اپنی جگہ اٹل ہوگئی۔ گرچہ دور حاضر کی مادیت پرستی نے اس آفاقی مذہب کے زور کو بہت حد تک کم کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ انسان کے لئے ایک فطری اپیل ہے اس لئے یہ امید کی جاتی ہے کہ موجودہ دور کا انسان بھی جب اپنی بربریت اور خوں ریزی سے تھک جائے گا تو آخرکار مذہب ہی کے دامن میں اسے امن اور سکون مل سکے گا۔

نظیر اکبرآبادی اپنے والد محمد فاروق کے نام کے اعتبار سے سنی مسلمان تھے۔ لیکن ان کو لوگوں نے امامیہ عقیدے کا بتایا ہے۔ وہ روزہ اور نماز کے پابند نہیں کے برابر تھے۔ یہاں تک کہ عیدین کی نماز بھی کبھی کبھی بجائے عیدگاہ کے گھر پر ہی ادا کر لیا کرتے تھے۔ البتہ تعزیہ داری سے بہت خوش اعتقادی تھی۔ چنانچہ محرم کے مہینے میں مسلسل پچاس دنوں تک مجلس عزا منعقد

کرتے اور سال بھر کی کمائی کی بچی کچھی رقم اس مد میں صرف کر دیتے تھے۔انہوں نے حضرت علیؑ کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی کہیں تعریف نہیں کی۔البتہ خاندان اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی اور حضرت علیؑ کی کرامات کو معجزات کا درجہ دیتے تھے۔لیکن ان حقائق کے باوجود اپنی وسیع القلبی اور عالی ظرفی کے باعث وہ سنی بزرگوں کے ساتھ بھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔مثلاً انہوں نے ایک نظم حضرت سلیم چشتی کی مدح میں کہی ہے۔

سلیم چشتی وہ بزرگ ہیں جن کی دعا سے جہانگیر پیدا ہوا تھا۔نظیر کا حضرت شیخ سلیم چشتی کی مدح میں اس طرح سرگرم کلام ہونا کہ ایک ایک شعر، ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ عقیدت اور ستائش و مدحت کا ایک بحر ذخار معلوم ہوتا ہے۔حضرت شیخ سلیم چشتی کی مدح میں نظیر کے اشعار سننے سے قبل عبدالباری آسی کا یہ نوٹ ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے ''کلیات نظیر اکبرآبادی'' میں اس نظم سے پہلے درج کیا ہے:-

> ''شیخ سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ حضرت بہاؤالدین کے فرزند ارجمند اور حضرت فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔آپ ہندوستان میں شیخ الاسلام اور عرب میں شیخ الہند کے نام سے مشہور تھے۔آپ کے

والد ماجد آپ کی ولادت سے قبل لدھیانے میں رہتے تھے۔اس کے بعد دہلی تشریف لاکر محلّہ سرائے علاؤالدین زندہ پیر میں مقیم ہوئے۔ چنانچہ حضرت شیخ کی ولادت بقول صاحب معارج الولایت ۸۸۴ھ میں اور بقول صاحب اخبارالاخیار ۸۷۷ھ میں واقع ہوئی۔آپ کے والد ماجد کسی وجہ سے دلی چھوڑ کر فتح پور سکری میں متوطن ہوئے تو وہیں ان کا انتقال ہوا۔اور پھر آپ اپنے بھائی موسیٰ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے اور چونکہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی لہذا آپ کو اپنے فرزندوں سے زیادہ سمجھا۔جب آپ سن شعور کو پہنچے تو عازم سفر ہوئے، مگر آپ کے بھائی کو یہ مفارقت بہت شاق گزری اور انہوں نے عذر کیا کہ تم کو کیوں کر جدا کروں۔میرے اولاد اور بھائی جو کچھ ہو تمہیں ہو۔آپ نے فرمایا کہ خدا تم کو لڑکا عنایت کرے گا۔چنانچہ اس کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔اور آپ سرہند تشریف لے گئے، جہاں شیخ مجدالدینؒ سے، جو اس وقت کے مشہور اور زبردست عالم تھے،آپ نے تکمیل علوم ظہری کی۔۹۳۱ھ میں آپ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں

متعدد حج کیئے۔ روضہ نبویؐ کے عرصہ تک مجاور رہے۔ اس کے بعد آپ عرب وعجم کی سیاحت میں مشغول رہے۔ اسی اثنا میں شیخ ابراہیم چشتی سے بیعت کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا، اور پھر آپ سے بہت لوگوں نے بیعت کر کے مراتب عالیہ حاصل کیئے۔ جب اس سفر طویل کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے تو سکری میں مقیم ہوئے اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ یہیں آپ نے عقد کیا، یہیں اہل وعیال کے ساتھ متاہلانہ زندگی بسر کرتے رہے اور بہت سی عمارتیں، باغ اور کنویں وغیرہ تعمیر کیئے۔ ۹۶۲ھ میں بعض پریشانیوں کی وجہ سے آپ پھر حج کے لئے تشریف لے گئے اور جب آپ دوبارہ حرمین شریفین سے واپس ہوکر فتح پور سکری میں مقیم ہوئے تو آپ نے اپنے عقیدت مندوں اور حاضر باشوں سے کہا کہ میں نے دو ارادے کیئے ہیں۔ ایک ان میں سے کرنا ضرور ہے۔ یا یہ کہ ترک طعام کروں یا ترک کلام۔ معتقدین نے عرض کیا کہ اگر سکوت اختیار کیا تو سب لوگ فیوض ارشادات سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لئے آپ نے ترک طعام کیا اور آخر عمر تک

کبھی سات آٹھ دن اور کبھی بارہ دن کے بعد آپ بقدر سد رمق باقی رہنے کے لئے ایسا کھانا کھالیا کرتے تھے کہ جس میں گوشت نہ ہوتا تھا۔ آخر ۲۹ر رمضان یوم پنج شنبہ ۹۷۹ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ اس سے پہلے اپنے صاحبزادے بدرالدینؒ کو یہ کہہ کر اپنا قائم مقام اور سجادہ نشین کیا تھا کہ حضرت گنج شکر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ فتح پور سکری میں مدفون ہوئے جہاں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ آپ کے خوارق عادات کی حکایات بہت سی ہیں جو کتب سیر وتذکرہ میں دیکھنا چاہئیں۔'' (۱)

ہیں دوجہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی
عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلماں حضرت سلیم چشتی
مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی

---

(۱) بحوالہ ''کلیات نظیر اکبر آبادی''، مرتب: عبدالباری آسی، اشاعت ۱۹۵۱ء، ص ۴۰۹

سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

شاہوں کے بادشا ہو یا تاج بانوا ہو

اور قبلۂ صفا ہو اور کعبۂ ضیا ہو

خلقت کے رہنما ہو دنیا کے مقتدا ہو

تم صاحب سخا ہو محبوب کبریا ہو

ہے تم سے زیب امکاں حضرت سلیم چشتی

پشت و پناہ ہو تم ہر اک شہ و گدا کے

محتاج ہیں تمہاری اک لطف کی نگہ کے

منزل پہ آکے پہنچے سالک تمہاری رہ کے

خاک قدم تمہاری در چشم مہر و مہہ کے

ہو روشنی کے ساماں حضرت سلیم چشتی

چشم و چراغ ہو تم اب جملہ مومنیں کے

روشن ہیں تم سے پردے سب آسماں زمیں کے

بیشک ضیائے دل ہو ہر صاحب یقیں کے

ذرہ نہیں تفاوت تم آسماں ہو دیں کے

ہو آفتاب رخشاں حضرت سلیم چشتی

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے

حرمت ہے دوستوں کو حضرت تمہاری رو سے

یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے

رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے

اے موجد ہر احساں حضرت سلیم چشتی

میں یہاں نظیر کی مزید نظموں کی پیشکش اوران نظموں کے حوالے سے اپنے خیالات رقم کرنے سے گریز کررہاہوں۔آئندہ باب میں جہاں نظیر کی نظموں کے پس منظر سے بات ہوگی وہاں دیگر نظمیں حوالے میں آئیں گی۔یہاں صرف یہ بات عرض کرتا چلوں کہ نظیر نے ایک طویل عمر پائی اور زندگی کے بہت سے نشیب وفراز کوبغور دیکھا۔اپنی مصروفیات کی وجہ سے انہیں اس کا موقع ملا کہ وہ سوسائٹی کے مختلف طبقے کے افراد سے رابطہ قائم کرسکیں اوراس قومی دھارے کوسمجھ سکیں جو متحدہ قومیت کی طرف بڑھ رہاتھا۔نظیر کاتعلق اگرکسی دربار سے ہوجاتاتوعوام سے کٹ کررہ جاتے۔پھر میلے ٹھیلے میں بچے کی طرح دلچسپی لیتے ہوئے نظیر کہیں گم ہوجاتے۔یہ اردوادب کی خوش قسمتی ہے کہ نظیر میلے کی بھیڑ میں بالک کی طرح

گم نہیں ہوئے بلکہ کھلی آنکھوں سے سارا تماشہ دیکھتے رہے اور جو کچھ دیکھا اسے دائرہ تحریر میں لاتے رہے۔

ہر زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ بڑے شاعروں اور بڑے افراد پر ہم عصر ادیبوں اور دانشوروں کے بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔نظیر نے کسی بڑے شاعر اور دانشور کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔وہ پوری زندگی عوام کے درمیان بسر کرتے رہے۔اس لئے نظیر کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہد کے عوام کو بھی نظر میں رکھیں۔آگرہ اور دہلی کے عوام ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ان میں غریب اور امیر بھی تھے، جاہل اور اہل علم بھی تھے۔بازاروں میں سبزی اور پھل بیچنے والے بھی نظیر سے خلوص رکھتے تھے۔اس تعلق نے نظیر اکبرآبادی کے نظریہ حیات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی۔

سیکولرزم کی وہ روایت جو مغل بادشاہوں سے پہلے دکن کے بادشاہوں نے قائم کی تھی اور جسے بعد میں مغل بادشاہوں نے تقویت پہنچائی، نظیر شناسی کے باب میں اہمیت کا حامل ہے۔سیکولرزم کا مطلب ایک ایسے نظریہ حیات ہے جو مذہب ذات پات کی بنیادوں پر بھید بھاؤ نہ کرے اور امتیاز من وتو کو جگہ نہ دے۔یہ بات سننے میں نئی نہیں معلوم ہوتی۔بڑے بڑے فقیروں، پیغمبروں اور درویشوں نے ایک پرامن زندگی کا ذکر کیا ہے۔

مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں ایک نئے فلسفے اور نظریے نے جنم لیا۔ تیرہوں اور چودہویں صدی میں بھگتی تحریک کی ابتدا ہوئی اور کئی بڑے اہم صوفیائے کرام ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ کبیر اور گرونانک اس سلسلے کے اہم نام ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی تعصب اور انتہاپسندی کم ہوئی اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے یہ محسوس کیا کہ ہم اسلامی نظام حکومت قائم کر کے ملک کی اکثریت کا دل نہیں جیت سکتے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظریہ حیات کو اپنایا جائے جو مذہب کی بنیاد پر سماجی زندگی میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھے۔ حکمرانوں کے اس رویہ نے عام ذہنوں کو متاثر کیا۔ اہل علم بھی اس طرف راغب ہوئے اور قومی زندگی میں سیکولرزم کی دھارا بہنے لگی۔ یہ سیکولرزم کسی طرح کا بائی پروڈکٹ نہیں تھا، بلکہ ایک نیا فلسفہ حیات تھا، ایک نیا طرز زندگی تھا اور زندگی گزارنے کا ایک نیا نصب العین تھا۔ اس فلسفے کا سرچشمہ زندگی کی قدیم اور ابدی قدر انسان دوستی تھی۔ یہ اسی چشمہ کا فیضان تھا کہ عوام وخواص نے قومی یکجہتی کا پہلا جام پیا۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہندوستان میں سیکولرزم کی ابتدا اور نشو ونما اسی مصلحت یا سیاسی حکمت عملی کی بنیاد پر نہیں ہوئی، بلکہ یہ وقت کا اہم تقاضہ تھا۔

نظیر اکبرآبادی نے اپنے عہد کے تقاضوں کو بہتر طور پر اور سب سے پہلے سمجھا۔ انہوں

نے دور وسطی کی عارفانہ اوررومانی شاعری سے ہٹ کراپنے لئے ایک نئی راہ اختیار کی۔ نظیرحقیقت نگارتھے۔ان کا کلام عوام الناس کے دلوں کو چھوتا ہے۔ان کی شاعری زندگی کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔انہوں نے اپنے عہداور معاشرے سے مختلف قسم کے موضوعات منتخب کر کے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا۔یہی وجہ ہے کہ جب ہم کلام نظیر کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے یہاں نظموں کی متعدد قسمیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں اور ہمارے مطالعے میں وسعت کا سبب بنتی ہیں۔

000

## باب سوم

# نظیر اکبر آبادی کی بعض نظموں کا پس منظر

گزشتہ باب میں اپنی بساط بھر نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی قسموں کا جائزہ لیا گیا۔ زیرِ نظر باب میں نظیر کی بعض نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کی سعی کر رہا ہے۔

نظیر نے اپنی نظموں کے ذریعہ لوک ادب کو بڑی حد تک تقویت پہنچایا ہے۔اس کے علاوہ فطرت نگاری، تہوار، میلوں ٹھیلوں، برسات، جاڑا، اوس، بسنت، آندھی، ہولی، دیوالی عید، شب برات وغیرہ نظیر کی شاعری کے پس منظر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

نظیر کی شاعری کا دوسرا پہلو صوفیانہ اور عوامی پس منظر رکھتا ہے۔ جیسے دنیا کی بے ثباتی، فنائے جہاں وبقائے رحمٰن، مذہبی رواداری، بے تعصبی، یکجہتی، قناعت پسندی، درویشی اور سادگی وغیرہ۔اسی طرح نظیر کی بعض نظمیں لوک گیت کا پس منظر رکھتی ہیں جیسے ''بنجارہ نامہ''، ''کلجگ''، ''جوگی نامہ''، ''کنہیا جی کا جنم''، ''درگا جی کے درشن'' وغیرہ۔عوامی پس منظر رکھنے والی نظموں میں ''آدمی نامہ''، ''روٹی نامہ''، ''کوڑی نامہ'' اور ''مفلسی'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

نظیر کی نظموں کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ نظیر کی شاعری کی ابتدا ہی ایسے ماحول میں ہوئی جب دلی بری طرح تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ جاٹوں، مرہٹوں اور نادر شاہی حملوں نے دہلی کو بے انتہا نقصان پہنچایا۔ جس کا اثر وہاں کے عوام اور خواص دونوں پر پڑا۔ وہاں کے بڑے بڑے امراء اور رؤسا اس وقت کے حالات سے پریشان ہو چکے تھے۔ عوام کا سکھ چین بھی جاتا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں نظیر نے جب شاعری شروع کی تو حالات کا اثر ان کی شاعری پر بہر صورت پڑنا ہی تھا۔

نظیر اکبر آبادی نظموں کا پس منظر عام آدمی اور اس کے گرد و پیش کا ماحول ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف و متنوع رنگ پیش کئے ہیں۔ جیسے موسم، تیوہار، میلے ٹھیلے اور صبح وشام کے مناظر پر ان کے یہاں خوب خوب نظمیں ملتی ہیں۔ تیوہاروں پر نظمیں لکھتے ہوئے انہوں نے ہر مذہب کے رہنما اور بزرگوں کو عزت، عقیدت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

نظیر نے موسموں کے ذکر میں بعض اہم نظمیں لکھی ہیں۔ جیسے ''برسات کی بہاریں''، ''جاڑے کی بہاریں''، ''گرمی کی بہاریں''، ''اوس'' وغیرہ۔ نظم ''برسات کی بہاریں'' کا ذکر کرتے ہوئے مخمور اکبر آبادی فرماتے ہیں:-

''اس نظم میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بے سود کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ہندوستان کی برسات کے قطرے قطرے کے دریا ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نظیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آواز سے صورت کے تخلیق اور ترنم سے کیفیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ اس نظم میں یہی التزام کیا گیا ہے۔ اس نوع کی مصوری کے لئے انہوں نے جا بجا ایسے موزوں اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ صورت مفہومہ کا سچا منظر اور کیفیت متعلقہ کا سچا اثر باصرے اور سامعے کے لئے پیدا ہو جاتا ہے۔''(۱)

اس پس منظر میں ذیل میں ''برسات کی بہاریں'' سے چند بند نقل کر رہا ہوں:

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ ، قطرات کی بہاریں

---

(۱) ''روح نظیر''، مخمور اکبرآبادی، ص ۴۵

ہر بات کے تماشے ، ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا

اور مور کی رٹن میں تیرا پیام ہے گا

یہ رنگ سو بڑے کا جو صبح و شام ہے گا

یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی

گلنار یا گلابی ، یا زرد ، سرخ دھانی

کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی

جھولوں میں جھولتے ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

محسوس کیا جاسکتا ہے کہ نظیر اپنی نظموں میں جزئیات نگاری سے ہر جگہ کام لیتے ہیں۔
برسات کی بہار کی عکاسی میں انہوں نے برسات کے ہر نقش کو اجاگر کیا ہے۔حتیٰ کے برسات

میں پانی اور کیچڑ میں پھسل کر گرنے کا ذکر بھی ان کے یہاں موجود ہے۔

اسی طرح نظیر کی ایک نظم ''برسات اور پھسلن'' بھی ہے۔یعنی نظیر نے برسات کے ہر پہلو کو نہایت دلچسپ انداز میں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اور بالکل فطری انداز میں۔ برسات کے موسم میں سڑکوں اور گلیوں میں جس طرح پانی اور کیچڑ کے سبب پھسلن پیدا ہو جاتی ہے اور آدمی اس میں سنبھل سنبھل کر چلنے کے باوجود گر پڑتا ہے۔دیکھئے اس کی منظرکشی نظیر نے کس طرح کی ہے:

دیکھو جدھر ادھر یہی غل ہے پکار ہے
کوئی پھنسا ہے پر کوئی کیچڑ میں خوار ہے
پیادہ اٹھا جو مر کے تو چھپڑا سوار ہے
گرنے کی دھوم دھام یہ کچھ بے شمار ہے
جو ہاتھی رپٹا ، اونٹ گرا ، خر پھسل پڑا
کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا
کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا

اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا

وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

جن کے نئے نئے تھے مکاں اور محل سرا

ان کی چھتیں ٹپکتی ہیں چھلنی ہو جا بجا

دیوایں بیٹھتی ہیں تو چھلوں کا غل مچا

لاٹھی کو ٹیک کر کے ستوں ہے کھڑا کیا

چھجا گرا ، منڈیری کا پتھر پھسل پڑا

اسی طرح ''نظم جاڑے کی بہاریں'' میں نظیر نے جاڑے کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ نظیر اپنی نظموں کے ساتھ ہر طرح انصاف سے کام لیتے ہیں۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ نظیر کو جزئیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔مثال کے طور پر یہ بند دیکھئے:

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو،تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اور پالا برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

چلا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جاڑے میں انسان پر کیا گزرتی ہے اس کا نظیر نے کس باریکی سے جائزہ لیا ہے یہ دیکھنے کی چیز ہے۔ جب کوئی شخص جاڑے میں سخت پریشان ہوتا ہے تو دوسرے اس کا ساتھ دینے یا اس پر رحم کھانے کی بجائے صرف اور صرف اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ شدید جاڑے میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا تجربہ کارانہ بیان نظیر کی زبان سے سنئے:

جتن ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی کشتی سی

تھرتھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی

ہو شور پھپھو، ہو ہو ہو کا، دھوم ہو سی سی سی کی

کلے پر کلہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی

ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آباندھ دیا ہو یہ چکر

جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو، ہر آن کڑاکڑا اور تھر تھر

پیٹی ہو سردی رگ رگ میں، اور برف پگھلتا ہو پتھر

جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو، اورتس پرلہریں لے لے کر

سناٹا باو کا چلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

نظیر کی اہم اور قابل ذکر نظم ''اومس'' بھی ہے۔ یہاں نظیر نے اومس کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ نظم کے مطالعے کے دوران قاری اومس کے سارے حالات سے باخبر ہو جاتا ہے۔ برسات کے بعد جو سخت گرمی پڑتی ہے اس وقت جو اثر انسان پر پڑتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اس موسم میں ہوا چلتی ہے اور پانی برسنے لگتا ہے ایسے میں کچھ سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد موسم پھر بدل جاتا ہے اور انسان اومس سے دوچار ہو جاتا ہے۔ ان دونوں صورت حال کی عکاسی ذیل کے دو بندوں سے آسانی سے ہو سکتی ہے:

بدلی کے گھر آنے سے جو ہوتی ہے ہوا بند

پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند

پنکھے کوئی پکڑے کوئی کھولے ہے کھڑا بند

دم رک کے گھلا جاتا ہے کرنے سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

گر اس میں ہوا کھل گئی اور پانی بھی لائی
تو جی میں جی اور جان میں کچھ جان سی آئی
اور اس میں جو پھر ہو گئی اومس کی چڑھائی
تو پھر وہی رونا وہی غل شور دہائی

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

اس طرح نظیر کی نظموں کی قسموں میں تہواروں سے متعلق لکھی گئی نظمیں بھی ہیں۔ جیسے ''راکھی''، ''دیوالی''، ''ہولی''، ''شب برات''، ''کنہیا جی کا جنم''، ''مہادیو جی کا میلہ'' وغیرہ۔

''ہولی'' ہندوؤں کا خاص تہوار ہے۔ اس کا لطف عوام اور خواص دونوں یکساں طور پر اٹھاتے ہیں۔ لیکن نوجوان اور خاص طور پر عوام کا طبقہ اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ نظیر نے نہایت سادہ انداز میں ہولی کی بہاروں کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر محض دو بند نقل کر رہا ہوں:

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

پریوں کے رنگ دمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ساغر بھی مئے کے چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

محبوب نشے میں جھکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا

وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوابوں کا

ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا

اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا

کپڑوں میں رنگ چھڑکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہولی میں محفل سجتی ہیں۔ راگ و رنگ کے ساتھ ساتھ شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ ناچ گانے اور موج مستیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ عوام اس جلسے میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ نظیر اس ماحول کا ذکر بھی بڑی خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے کرتے ہیں:

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے، کچھ ڈھولک اور مردنگ بجے

کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجے

کچھ تار تنبوروں کے جھنکے، کچھ ڈھمڈھمی اور مرچنگ بجے

کچھ گھنگھرو چھنکے چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجے

ہے ہر دم ناچنے گانے کا ، یہ تار بندھایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھرے، اور سوانگ بھی کیا کیا آتے ہیں

کر باتیں ہر دم چہل بھری، خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں

کچھ جوگی چیلے بنتے ہیں ، کچھ کامنیوں کی گاتے ہیں

کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں، کچھ ناچتے ہیں کچھ گاتے ہیں

ہر آن نظیر اس فرحت کا ، سامان دکھایا ہولی نے

''راکھی'' ہندوؤں کا ایک مقدس تہوار مانا جاتا ہے۔ عوام کے علاوہ خواص بھی اس میں نہایت خلوص اور رچاؤ کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ اسے محبت کا تہوار کہا جاتا ہے۔ اس تہوار نے نظیر کو بھی خوب خوب متاثر کیا۔ ہندوستانی عوام کے جذبات اور احساسات کی عکاسی جس خوبصورت انداز میں اس نظم میں کی گئی ہے وہ پڑھنے اور لطف اٹھانے سے تعلق رکھتی ہے۔ محض ایک بند ملاحظہ کیجئے:

ادا سے ہاتھ اٹھنے میں گل راکھی جو ہلتے ہیں

کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں

کہاں نازک یہ پہنچی اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں

چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں

جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

دیوالی بھی ہندوؤں کا اہم تہوار ہے۔ اپنی نظم ''دیوالی'' میں بھی نظیر نے نہایت بے تکلفی سے آتش بازی، جوا کھیلنے، بازی لگانے اور شراب پینے وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح عوام وخواص دونوں اس تہوار میں چہل پہل کا لطف اٹھاتے ہیں اور بقول نظیر اکبرآبادی:

''سبھوں کے سر پہ چڑھا بھوت سا دیوالی کا''

دیوالی میں ایک خاص طبقے کے افراد پر جوا کا نشہ سوار رہتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ جب جواری جوا ہار جاتے ہیں تو اس کے گھر کے افراد اسے ہر طرح برا بھلا کہتے ہیں اور اس کی عزت بھی مٹی میں مل جاتی ہے۔ حتیٰ کے اس کی بیوی بھی اس سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ بات بات میں تکرار اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس کی بیوی اسے ''بھڑوا'' تک کہہ دیتی ہے۔ دیکھئے کس طرح فطری انداز سے نظیر نے اس موقع کی عکاسی کی ہے:

کسی کی جورو کہے ہے پکار دے بھڑوے

بہو کی نو گرہی بیٹے کے ہاتھ کے کھڑوے

جو گھر میں آوے تو سب مل کہے ہیں سو گھڑوے

نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے

خدا نے تجھ کو تو شہدا کیا دیوالی کا



مسلمانوں کے تہوار میں شب برات نہایت مقدس اور اہم تہوار ہے۔ اس تہوار میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، حلوے تیار کئے جاتے ہیں، مردوں کے نام فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ نظیر اپنی اس نظم (شب برات) میں ان تمام باتوں کا ذکر کرتے ہیں اور نہایت پر لطف انداز میں کرتے ہیں۔ ذیل میں اس نظم سے صرف دو بند نقل کر رہا ہوں، جس سے پورے ماحول کی عکاسی ہو جاتی ہے:

دنیا کی دولتوں میں جو زردار ہیں پڑے

قندوں کے حلوے روغنی نانیں نئے گھڑے

پہنچاتے خوان بھرتے ہیں نو کر کئی پڑے

زندے بھی راہ تکتے ہیں مردے بھی ہیں کھڑے

ان خوبیوں کی رکھتی ہے تیاری شب برات

چہرہ کسی کا جل گیا آنکھیں جھلس گئیں

چھاتی کسی کی جل گئی بانہیں جھلس گئیں

ٹانگیں بچی کسی کی تو رانیں جھلس گئیں

مونچھیں کسی کی پھنک گئیں پلکیں جھلس گئیں

رکھے کسی کی داڑھی پہ چنگاری شب برات

عیدالفطر مسلمانوں کا سب سے اہم تہوار ہے۔اس کی خوشی ہر دل میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔نظیر بھی عوام وخواص کی اس خوشی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور ان کے جذبات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عید کا سارا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔نمونے کے طور پر صرف ایک بند پیش کر رہا ہوں:

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی

اور زاہد وں کو زہد کی تمہید کی خوشی

رند عاشقوں کو ہے کئی امید کی خوشی

کچھ دلبروں کے وصل کی کچھ دید کی خوشی

ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسے ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

نظیر کی ایک نظم ''عید گاہ'' بھی ہے۔ آگرہ کی محبت نظیر کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی۔ یہاں کی ہر چیز کی تعریف میں وہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہ عید گاہ کے مناظر کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

ہے دھوم آج مدرسہ و خانقاہ میں
تاتیں بندھیں ہیں مسجد جامع کی راہ میں
گلشن سے کھل رہے ہیں عجب کج کلاہ میں
سو سو چمن جھمکتے ہیں اک اک نگاہ میں
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عید گاہ میں

کچھ بھیڑ سی ہے بھیڑ کہ بے حد و بے شمار
خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہے بندھے ہر طرف ہزار
ہاتھی و گھوڑے، بیل، رتھ و اونٹ کی قطار
گل شور بالے بھولے کھلونوں کی ہے بہار

کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عید گاہ میں

نظیر کی نظموں کا پس منظر آگرے کا ماحول اور میلے ٹھیلے کا منظر بھی ہے۔ نظیر نے میلے ٹھیلے سے متعلق جتنی نظمیں کہی ہیں ان کے مطالعے سے نظیر کی فطرت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بقول وحید الدین سلیم نظیر نے عام لوگوں کی زندگی اور ان کے حالات وخیالات نیز مشاغل کو اس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے اور ایسی سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس باب میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہندوستانی تہذیب اور تمدن نظیر کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ ان کی کسی بھی نظم کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ہر جگہ ہندوستانی رنگ، ہندوستانی تہذیب و کلچر اور ثقافت کی کارفرمائی ملے گی۔ نظیر نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، نہ سکھ نہ عیسائی بلکہ وہ ہندوستانی ہیں اور صرف ہندوستانی ہیں۔

نظیر کی ایک نظم ہے ''بلدیو جی کا میلہ'' اس نظم میں نظیر نے میلے کے علاوہ اس دور کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے اور ہندوؤں کے یہاں کی تلمیحات کو نہایت خوبصورتی سے نبھایا ہے جیسے یہ بند دیکھئے:

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں باراہ کہیں مدن موہن کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن

سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن　　کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن

کہیں نکلا ہے سیر کو بن بن　　کہیں کہتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

نظیر کے نظموں کے خمیر میں کھیل تماشے بھی ہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن سے ہی نظیر کی کھیل تماشوں میں دلچسپی رہی ہے۔کھلنڈرا پن اور خوش مزاجی ان کے مزاج کا خاص حصہ ہے۔وہ کبھی ایک جگہ بیٹھے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ عوام کی محفلوں میں شریک ہوتے اور ان کے کھیل تماشوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔اسی لئے عبدالغفور شہباز لکھتے ہیں کہ:-

''جبھی تو حضرت کی ہمدردی اس قدر وسیع ہے کہ برے سے برے اخلاق اور پاجی سے پاجی خیالات اور ناپاک سے ناپاک مشغلے کے آدمی کو بھی یہ نظر عداوت سے نہیں دیکھتے۔ہر ایک کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی اور الفت ہے۔''(۱)

---

(۱)''زندگانی بے نظیر''، عبدالغفور شہباز، ص ۳۲۸

نظیر کی نظموں کے پس منظر میں دنیا کی بے ثباتی، فنائے جہان اور بقائے رحمٰن کا ذکر ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''زندگانی بے نظیر'' میں عبد الغفور شہباز نے نظیر کا عرصۂ حیات ۱۷۳۵ء سے ۱۸۳۰ء تک متعین کیا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے دلی پوری طرح تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ نظیر کی زندگی کے ابتدائی بیس پچیس سال یہیں گزرے۔ چنانچہ اس دردانگیز اور کرب ناک حالات سے نظیر نے گہرے طور پر اثرات قبول کئے۔ انہیں حالات نے نظیر کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات پیدا کئے اور نظیر کو عوام سے قریب تر کر دیا۔ اور اسی احساس نے نظیر سے اس قسم کے اشعار کہلوائے:

جو تو کہتا ہے اے غافل ''یہ میرا ہے یہ تیرا ہے''
یہ جس کا ہے اسی کا ہے ''نہ تیرا ہے نہ میرا ہے''
تری کیا ذات ہے کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے
مسافر بے وطن ہے یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک
تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

نظیر کی نظموں کے پس منظر میں ہر وہ چیز سمٹ آئی ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے

ہے جیسے تاج، تخت، کپڑے، باپ، ماں، بھائی، بہن، بیوی اور بچے، ہنسی، رونا، شادی، بیاہ، امیری، غریبی، فقیری، وزیری—— غرض نظیر کی شاعری کے پس منظر میں ہر چیز سمٹ آئی ہے۔

000

# باب چہارم

# تاریخی واقعات تک نظیر اکبرآبادی کی فنکارانہ رسائی

تاریخی واقعات تک نظیر اکبرآبادی کی فنکارانہ رسائی پر نگاہ ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کے یہ اشعار آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں:

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یارب تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا
لے عرش سے تا فرش نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے، ہر اک آن تماشا
افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات
اور روئے زمیں پر گل و ریحان تماشا
جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر
انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا

جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر، آہ
کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا
چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا
گر عشق کے کوچے میں گزر کیجئے تو واں بھی
ہر وقت نئی لہر ہے ، ہر آن تماشا
منہ زرد ، بدن خشک ، جگر چاک ، الم ناک
غل ، شور ، تپش ، نالہ و افغان تماشا
ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ
سب ارض و سما کا ہے گلستان تماشا

نظیر اکبر آبادی کے اگر ان اشعار پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نظیر کی نظموں کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ کوئی بھی فنکار اپنے عہد اور عہد ماقبل کے اثرات قبول کرتا ہے۔ چنانچہ نظیر کی شاعری کے پس منظر پر نگاہ ڈالنے کے لئے ان کے عہد اور عہد ماقبل کے تاریخی واقعات کا ایک سرسری

جائزہ لیناضروری ہے۔

نظیر کا عہد وہی ہے جو محمد شاہ رنگیلے کا عہد ہے۔اس زمانے میں مغلیہ سلطنت تیزی سے انحطاط پذیر تھی اور جاگیردارانہ نظام ختم ہورہا تھا۔اگرچہ بادشاہ ساز سید برادران اٹھا کر پھینک دئے گئے تھے مگر سیاسی قوت واپس نہیں آئی تھی ۔نئے شہنشاہ محمد شاہ کے زیر اثر ایسی کوئی قوت نہیں تھی جو حالات کے دھارے کو بدل دے۔اس دور حکومت میں کئی اہم عوامل سامنے آئے۔جیسے دیہی بے چینی،سیاسی بے استحکامی،ایرانیوں اور مقامی لوگوں کے درمیان تہذیبی جھگڑےاور معاشرتی زندگی میں عوام کی آزادہ روی۔

یہ عوامل ایسے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے،اور جو محمد شاہ سے قبل وجود میں آچکے تھے اور مغلیہ سلطنت کو نیست ونابود کرنے کا ذریعہ بن چکے تھے۔مشہور ومعروف فرانسیسی سیاح برنیئر(Bernier)نے اپنے سیاحت نامہ "Travels in the Moghul Empire"میں نہایت صاف اور واضح طور پر دیہی بے چینی کو اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف ’’حجت البلاغہ‘‘ اور’’سیاسی مکتوبات‘‘ میں پانچ اہم وجوہات کی نشاندہی کی ہے جو اس تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔جیسے سرکاری زمین کی محدودیت،محصول کی کم وصولیابی،منصب داروں کی تعداد میں اضافہ،

جاگیردارانہ اجارہ داری کے تباہ کن اثرات، فوجیوں کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی۔ یہ وہ وجوہات تھے، جن کے سبب حالات میں تیز رفتاری سے تبدیلی آئی۔ ان وجوہات کے علاوہ مفت خوروں پر بڑھتے ہوئے خرچ اور غیر منفعت بخش چیزوں پر اور غیر پیداواری اشیا پر سرمایہ کاری کا دباؤ بھی ہے۔

قدرتی طور پر اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جو اپنی صلاحیت اور استعداد سے زیادہ خرچ کرنے لگا۔ ظاہر ہے یہ عمل فطری طور پر ہوا تھا۔ استعداد سے زیادہ خرچ کا اثر سیدھے طور پر معاشرت پر پڑا۔ دراصل معاش کا انحصار کسانوں اور دوسرے مزدوروں کی محنت پر تھا۔ یہ بگڑا ہوا توازن تمام معاشی زندگی پر چھا گیا۔ آہستہ آہستہ یہ استحصالی نظام درہم برہم ہونے لگا اور وہ کندھے جن پر اس غیر فطری معیشت کا بوجھ تھا، تھکنے اور ہمت ہارنے لگے۔ اقتصادیت بگڑ گئی، کیوں کہ زراعت اس معیشت کا اہم رکن تھی۔ دیہی بے چینی عظیم بحران کا پہلا اشارہ تھا۔ دیہی بے چینی نے باغیوں کو جنم دینا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کچھ علاقائیت، فرقہ واریت، نسلیت اور دوسری شکلوں میں ظاہر ہوئے، مگر ان کا ماخذ زراعتی اور معاشی تھا۔ حکمراں طبقہ، منصب دار اور امراء اخراجات میں اضافہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے طبقوں کا بے رحمانہ اور مجرمانہ استحصال کرتے تھے۔ مجبور لوگوں نے شروع میں اسے برداشت

کیا مگر بعد میں اس جبر کے خلاف بغاوت کر دی۔ مرکزی قوت کمزور ہونے کی وجہ سے مقامی امیر اور علاقائی لیڈروں نے اپنی اپنی فوج بنانی شروع کر دی اور اس طرح بہت سے طاقت ور گروہ پیدا ہو گئے۔ یہ گروہ موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت آزمانے لگے۔

اس سلسلے میں پروفیسر عرفان حبیب کی کتاب ''مغل سلطنت کے زوال کے دیہی اسباب'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں تبصرہ کرتے ہوئے کسانوں کے انقلاب کے کردار اور ان کی فطری قوتوں کا جائزہ لیا ہے۔ جاٹوں، ست ماہٹوں کی تین اہم بغاوتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ بظاہر یہ تین مذہبی یا نسلی جھگڑے دراصل کسانوں کی تحریکیں تھیں۔ ان تحریکوں نے سیاسی غیر استحکامی کی راہوں کو ہموار کیا اور کئی نئی سیاسی قوتوں کو قابل عمل بنایا۔ اسی مباحثہ کے پیش نظر اس زمانے کی خاص بات یہ ہے کہ محمد شاہ کا زمانہ حقیقت میں ایک خواب کے چکنا چور ہو جانے کا زمانہ تھا۔ یہ دور ہر طرح سے مسائل سے گھرا ہوا تھا۔ اس دور کے پاس ایسا کوئی منصوبہ یا حل نہیں تھا جو روشن مستقبل کی ضمانت بن سکے۔ اس عہد کے پاس عوام کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی سبیل نہیں تھی۔ اس لئے یہ دور ناکامیاب ثابت ہو گیا تھا۔ ناامیدی کو اگر امید میں تبدیل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ محمد شاہ کے دور کے پاس ایسی کوئی دور بینی یا دروں بینی نہیں تھی جس کے آئینے میں مستقبل کی خوش حالی

کی تصویر نظر آتی۔

غیر ملکی ایرانی اور ترکی تہذیبوں اور زبانوں کی گرفت ملکی تہذیب اور زبان کے دباؤ سے متواتر ڈھیلی پڑتی جارہی تھی۔ نچلے سماج کے نئے سیاسی لیڈر اپنے اپنے علاقے کی زبان بولتے تھے اور ان کے طور طریقے سلیقے مند ایرانی مصاحبوں جیسے بھی نہیں تھے۔ یہاں تک کہ تعلیم بھی اس اثر سے بچ نہیں سکی۔ فارسی جس کا دور دورہ تھا، اب نئی زبان (فارسی اور ترکی جملوں میں پنجابی، برج اور کھڑی بولی کے لفظوں کی آمیزش سے بنے کلمات) کے آگے مجبور تھی۔ یہ نئی زبان تیزی سے پھل پھول رہی تھی، علاقائی عدالتوں اور مقامی سرداروں کی وفاداری نئی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے منتقل ہو رہی تھی۔ جلد ہی وہ وقت بھی آ گیا جب دہلی کا شہنشاہ شاہ عالم اردو (ریختہ) میں اشعار کہنے لگا۔

اسی تاریخی پس منظر کا تیسرا اہم پہلو ہمارے ادب میں سرایت کی ہوئی انسانی رسموں کا جاری رہنا ہے۔ تناؤ اور سختی کا دور اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی تنگ نظری، تعصب اور اختلافات کے باوجود ہمہ وقت آزاد خیالی، انسانیت پرستی یہاں پھل پھول رہی تھی، جس نے آپس میں تقسیم اور نفرت پیدا کرنے والی مذہبی رسموں کو توڑ ڈالا اور اتحاد کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ کبھی کبھی انسانیت پرستی نے اس قدر اونچی پرواز کی کہ مذہب کے ذریعہ حقیقت تک رسائی کی نئی راہیں

متعین کیں اور مذہب کی رسمی بندھنوں سے خود کو آزاد کرلیا۔

مشہور ومعروف مورخ آرنلڈ ٹوئن بی (Arnold Toynbee) نے اس سلسلے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج جو دنیا میں بڑے بڑے مذاہب ہیں وہ سب کے سب سوائے زرتشت مذہب کے حقیقت میں انہیں دو خطوں ہندوستان یا مغربی ایشیا میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں ہندوستانی مذاہب کی روح الگ ہے۔ جہاں یہ مذاہب آپس میں ہل مل چکے ہیں، وہاں ان کا ملاپ تیل اور کھٹائی جیسا ہے۔ ان مذاہب کی بنیادی ملاقات کی جگہ ہندوستان ہی ہے۔ جہاں اسلام کا ہندو مذہب سے متشددانہ تصادم ہوا۔ مجموعی طور پر ہندوستان کی سرزمین پر ان دونوں عظیم مذاہب کی ملاقات ہوئی۔ مگر اس ملاقات کی کہانی بھی درد بھری کہانی ہے۔ مگر دونوں طرف بدگمانی اور دشمنی ورنجش کی دیوار کے باوجود کچھ لوگ صاحب بصیرت بھی تھے، جنہوں نے ہندو مذہب اور اسلامی عقائد کی روح میں ایسے اوصاف پالئے تھے جو بنیادی سچائی ہیں اور جن کے ذریعہ دونوں مذاہب میں ہم آہنگی پیدا ہوسکتی تھی۔

ہم آہنگی یا مل جانے یا مصالحت کر لینے کا یہ مطلب دونوں مذاہب کا مشترکہ محاذ نہیں ہے۔ بعض معاملات میں اختلاف تھا، یہاں تک کہ اس کے خلاف بغاوت بھی، لیکن عام انسانی زندگی کی حقیقت کے سوال پر سیدھا سادا عام خیال تھا۔ زیادہ تر متبدل تحریکوں اور

رجحانات پر انسان پرستی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن موجودہ سلسلے میں سوچتے ہوئے الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ اس زمانے کے دانش مندوں کو اپنی راہیں چننے کا اختیار تھا۔ وہ روٹی کی وجہ سے مجبور نہیں تھے۔ وہ نئی بصیرت اور آرزو کی طلب رکھتے تھے۔ بادشاہوں اور نوابوں کے ذریعہ عظمت حاصل کرنے کے راستے مسدود ہو چکے تھے، کیوں کہ وہ آنے والے سیاسی طوفان کے لئے فکر مند نہ تھے اور آپسی عداوتوں میں مبتلا تھے۔ چنانچہ فنون لطیفہ کو فروغ دینے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ ایسے میں رئیسوں کی سرپرستی ہی عہد وسطیٰ میں تعلیم وتہذیب کی ترقی کا ایک راستہ تھی۔ قدرداں طبقہ مشغول تھا۔ اس لئے شاعر اور فنکار قدر اور ہمت افزائی سے محروم تھے۔ میر کے لفظوں میں:

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

میر کی تصدیق معروف ہم عصر شعرا کی شہادتوں سے ہوتی ہے۔ اکثر سیاسی حالت کی بے استحکامی، بڑھتی ہوئی بے چینی اور پریشانی کی شکایت کرتے ہیں۔ میر تقی میر نے وقت کی آواز کو پہچان لیا تھا۔ انہیں اپنی شخصیت کا بھی عرفان حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ رنج وغم کو

جوشاعروں اورفنکاروں کے ذریعہ اپنے تعارف کا انتظار کررہی ہے۔وہ بحران جس نے میر کو افسردگی اور فلسفے میں الجھایا،سودا کوطنز کی راہ دکھائی اور دردکوعارفانہ درددیا،اس نے نظیر کے سامنے ایک پوری دنیاروشن کر کے رکھ دی۔وہ شعرا کے سامنے راہ نمابن کرآئے۔اس حقیقی شاعر کے اندرسیر بینی تھی۔پرنور،رنگین اور پرآواز۔وقت کے نشیب وفرازاورحکمراں طبقے کے سماجی بندھن کے باوجود عام آدمی نے زندگی کو پرکشش بنائے رکھا اوراس میں شان پیدا کرتا رہا۔اس شان سے نظیر کا تعلق محبت اوروفاداری کے ساتھ تھا۔

تاریخی پس منظر میں یہ بات واضح اور منطقی ہے کہ محمد شاہ کے زمانے میں دیسی عوامل جاگ رہے تھے۔اس زمانے میں وہ دور بھی آیا جب شمالی ہندوستان میں شہری تہذیب میں رچے بسے ترکی وفارسی اثرات کی جڑیں گلنے لگی تھیں۔ایک نئی لہر سامنے آرہی تھی جوایک طرف ترکی وفارسی اثرات کوقبول کرنے سے انکار کررہی تھی اور دوسری طرف ایسی بنیاد پرقائم جاندار عناصر کواپنارہی تھی ۔مصوری اورفن تعمیر میں راجپوتی تصورات ظاہرہورہے تھے۔اسی طرح ہندوستان کامخصوص سُر اس زمانے کی موسیقی میں جھلکنے لگا تھا۔

ڈاکٹرسیدعبداللہ نے اپنے ایک مضمون ''میراورمیں''،مشمولہ: ''نقدمیر'' میں لکھا ہے کہ محمد شاہ کادورفن کے نقطۂ نظر سے اس کی احیا کازمانہ تھا۔یہ تحریک احیا مغل اور ہندی کلچر کی

تحریک تھی۔محمد شاہ خالص راجپوتی طرز حیات کا حامی نہ تھا،مگر خالص مغلئی طرز حیات کو دوبارہ زندہ کرنا بھی اس کے بس کی بات نہ تھی،لہذا وہ ایسے کلچر کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا جو قومی بھی ہو اور نسلی بھی اور دیسی و مقامی بھی۔جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہوں۔محمد شاہ شاید پہلا مغل بادشاہ تھا جو ترکی زبان سے ناواقف تھا۔یہ مقولہ عام تھا کہ ''بر محمد شاہ ترکی تمام شد'' (محمد شاہ پر ترکی ختم ہوگئی) اب اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔اس کی حکومت طویل عرصے سے ہندو عوامل کے زیر اثر تھی،اور ہندوانہ کلچر کا رنگ خوب جم چکا تھا۔محمد شاہ نے اس کے تانے بانے کو ریختہ سے بُنا۔ریختہ خود مختلف عناصر کا میل تھا۔یہ میل ادب،فن،علم اور تہذیب سب میں مل کر ہر طرف پھل پھول رہا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تہذیبی سنگم نے محمد شاہ کے زمانے میں نیا رخ اپنایا تھا۔لیکن محمد شاہ کو حقیقت میں اس عمل میں مشکل سے ہی حصہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔دراصل اس نے اس عمل کو تسلیم کرلیا تھا جو اورنگ زیب کے زمانے سے جاری تھا یا پہلے ہی سے ابتدائی شکل میں عملی طور پر اس کا ظہور ہو چکا تھا۔جس کو ڈاکٹر عبداللہ ''ہندوآئزیشن'' کہتے ہیں حقیقت میں دیہی اور شہری عوام پر مختلف مرحلوں میں ترکی،فارسی اور ہندی تہذیبوں کی مشترکہ آبیاری تھی۔بازاروں،خانقاہوں،میلوں اور تہواروں میں ایک نئی تہذیب نے جنم لیا تھا،جس میں دیسی اثرات کے ساتھ ساتھ جاندار ترکی اور فارسی اثرات بھی جھلک رہے

تھے۔امراءنئی تہذیب کے دباؤ کو روکنے کی کوشش کررہے تھے تاکہ اپنی خالص غیر ملکی تہذیب کی برتری قائم رکھ سکیں۔ان کو شکست محمد شاہ کے عہد میں ہوئی۔اس تبدیلی کے لئے محمد شاہ لائق مبارکباد تو ہوسکتے ہیں لیکن ان کو رہنما کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو نظیر کے علاوہ کسی کے یہاں بھی اس درجہ حساس تاریخی شعور نہیں ملتا ہے،یا کسی بھی فنکار کی تاریخی واقعات پر اس درجہ فنکارانہ رسائی نہیں ملتی ہے۔تہذیبی و تاریخی واقعات تک رسائی کی اتنی بڑی شہادت اور شاید ہی کہیں مل سکے گی۔نظیر کی شاعری راجدھانی اور دربار سے بہت دور،بادشاہت کے اثرات سے محفوظ ،زیادہ تر آگرہ میں لکھی گئی۔یہ کلام عوام کے لئے عوامی شاعری تھا۔عملی طور پر یہ تہذیبی و تاریخی اتحاد نظیر کے یہاں معاصرین کے مقابلے میں (جو دربار اور محمد شاہ کی دلی کے قریب تھے) بغیر کسی زور وجبر کے مکمل ہوگیا۔یہ امر اس بات کی گواہی کے لئے کافی ہے کہ اس تہذیبی ملاپ کے عمل کی جڑیں عوام میں پیوست تھیں جو ان کے درمیان مقبول ہوا،وہ شاہی محل کی چہار دیواری میں بھی عام ہوا۔دراصل یہ ایک عمل تھا۔بعض حضرات اسے تبلیغ کا نام دیتے ہیں،جو بہرحال درست نہیں ہے۔اس اشتراک کا سبب ہندو اور اسلامی عارفانہ خیالات میں اتحاد اور صوفی اور بھگتی تحریک میں یکسانیت ہے۔

اس یکجہتی کو اکثر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور نتائج کو حد درجہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامی تصوف اور بھگتی انداز دونوں اپنے اپنے انداز میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے اپنے مذاہب کی رسموں اور تہواروں پر وہ رسماً بھی اپنی دینی حدود سے آگے نہیں بڑھتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ صرف ان کے یہاں مذہب کا حقیقی نچوڑ ہے اور دوسرے صرف دعویٰ کرتے ہیں۔ صوفی اور بھگت، انسان پرستی تک مذاہب کے ذریعہ پہنچتے ہیں۔ جب وہ انسان سے محبت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا کلام حقیقی زندگی سے بہت دور نظر آتا ہے جیسے انہوں نے دوسری دنیا میں، اس دنیا کے عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی جگہ بنا رکھی ہو۔ وہ بنی آدم کے جذبات جو حقیقی عقل اور انسانیت سے سچے پیار کی بنیادیں ہیں، میں حصہ لینے کا حق سمجھتے تھے۔ بغیر صوفیانہ رنگ کے انسان سے پیار نہ صرف اردو شاعری میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے بلکہ اس زمانے کی تمام موجودہ زبانوں میں بھی یہی انداز ہے۔

نظیر اکبر آبادی واحد مثال ہیں جو صوفی خیالات کے حامی ہوتے ہوئے بھی صوفی نہیں تھے۔ انہوں نے عام انسانوں کی طرح ناکامیوں اور کمزوریوں کے ساتھ زندگی کے دن گزارے۔ وہ ایک لامذہب کے انداز میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی نگاہ میں دنیا دلچسپ اسرار، خوبصورت سراب اور ایسی پیچیدہ جگہ ہے جس کا حال جاننا کسی فلسفی یا غیب داں کی رسائی

سے باہر ہے۔ عام آدمی سے ان کا لگاؤ کوئی معمولی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ جذباتی طور پر عام انسان سے وابستہ تھے اور اس سے محبت کر کے شاداں و فرحاں ہوتے تھے۔

نظیر ایک منچلے خانہ بدوش تھے۔ زندگی کی رنگ رلیوں سے سیر ہونے کا اظہار ہی نظیر کی شاعری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بگڑے ہوئے لاابالی تھے جو چھوٹے لوگوں کے ساتھ خوش رہتے تھے۔ باوجود اس کے نظیر جس قسم کا کلام چھوڑ گئے ہیں وہ آسانی سے نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ان کے حسین اور گہرے مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ آگرہ کی شہری زندگی میں جو مستیاں تھیں، جو حسن اور عشق تھا، جو تفریحات، بے ہودگی اور عامیانہ پن تھا، اس کو نظیر نے بڑی ایمانداری اور وفاداری سے پیش کیا ہے۔ وہ دبی زبان سے نہیں لکھتے تھے، وہ بے شرمی کو دیکھ کر چھپ چھپ کر نہیں ہنستے تھے، وہ اپنی آوارہ گردی پر نادم نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو آزادانہ طور پر اور بے فکری سے گزارا تھا اور اپنے کسی راز پر پردہ پوشی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

نظیر کا نام جذباتی اظہار بیان کی وجہ سے زندہ ہے۔ ان کی شاعری، مقام و منظر، میلے تہوار، گزرے واقعات اور دلچسپیوں کی تصویر گاہ ہے۔ وہ بھیڑ بھاڑ کے بہت شوقین تھے۔ جشنوں، رنگینیوں اور ولولہ انگیز شور شرابہ سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کی نظمیں ''بلدیو جی کا میلا''

''ہولی''، ''شب برات''، ''عید'' وغیرہ مقامی رنگ رلیوں کا نمونہ ہیں۔ ساتھ ہی ان میں گہرا سماجی اور تاریخی شعور پایا جاتا ہے۔ ان کی نظمیں ایک مالا کے مختلف دانے ہیں جو ایک دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ دھاگہ جذبات کا دھاگہ ہے جو خواہ مخواہ کی دانش مندی سے آزاد ہے۔ اس وجہ سے ان کی نظموں میں جوش وخروش پیدا ہو گیا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ ان کی شاعری کا کینوس محدود ہے اور وہ بار بار ایک ہی موضوع کو دہراتے ہیں۔ مگر یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ نظیر اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے میں کس درجہ مہارت رکھتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ نظیر اپنے زمانے میں شعرا کے زمرے سے باہر تھے۔ ادبی اصولوں سے لاپروائی اس کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کا اپنا جداگانہ انداز ہے جو ان کی اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات سے آیا ہے۔ مناظر کی خوبصورت تصویر اتارنے میں نظیر کو کمال حاصل ہے۔ اس سے قبل ایسی منظر کشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غیر مانوس الفاظ کو مانوس بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

نظیر علم الانسان سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں، بچوں اور بوڑھوں، امیروں اور غریبوں، دیہاتیوں اور شہریوں، فقیروں اور دنیاداروں، صوفیوں اور سنتوں سب

سے ملتے جلتے تھے اور ان کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے۔

پروفیسر احتشام حسین نے ۱۹۴۹ء میں نظیر پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ یہ مقالہ ''تنقیدی جائزے'' کے مضامین میں شامل کیا ہے۔ ان کا ایک اور مضمون ''ذوق ادب اور شعور'' (۱۹۵۵ء) میں بھی شامل ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے نظیر کے تاریخی پس منظر کو دیکھتے ہوئے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مندرجہ ذیل عوامل نے ان کی شخصیت اور شاعری کی نشو ونما میں مدد کی ہے۔ مثلاً آگرے کی تہذیبی اہمیت، جو اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کی راجدھانی تھی، وشنو وادیوں کی بھگتی تحریک کا مرکز، برج بھاشا میں شاعری اور اس کی تدریس کا مقام، سورداس اور میرابائی کی شاعری کا سرچشمہ اور لاتعداد راگ اور راگنیاں باوجود بہت سی سیاسی تبدیلیوں کے زرعی معیشت کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس لئے تہذیب وتمدن کے نظریے میں بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہندوستانی سرمایہ سے جس وقت انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کی تشکیل ہو رہی تھی، اس وقت ہندوستانی بے کس و بے بس اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ عنقریب ان کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔ آگرہ کبھی شاندار ماضی کا شہر تھا اور اب برطانوی لوٹ مار کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس نظیر کی شاعری میں موج ومیلہ کی باتیں ہیں تو دوسری طرف موت وتباہی اور

بربادی کی خبرداری بھی ملتی ہے۔

نظیر نے اپنے وقت کی پکار کا جواب اپنے عظیم معاصرین کے برعکس دیا۔مثال کے طور پر میر،سودا اور درد نے خودکوذہنی طور پرافسردہ،طنزنگاراورصوفی بنا کردیوالیہ سماج کے اثرات کا مقابلہ کیا۔نظیر نے خودکواعلیٰ سماج سے علاحدہ کر کے امید کے نئے دیپ جلائے، عوام کی روزانہ زندگی میں نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔اس ولولے نے ان کو بحیثیت فنکار کے سہارادیااوروہ اسی حوالے سے اردوشاعری کے افق پرتابندہ ستارے کی مانند ابھرے۔

نظیرا کبرآبادی سے اردوشاعری میں نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔یہ بات کہی جا چکی کہ نظیراردوشاعروں میں سب سے مختلف تھے۔اس لئے ان کی شاعری کا رنگ وآہنگ بھی سب سے الگ ہے۔اردوشاعری کومغلیہ حکومت کے زوال کے زمانے میں عروج حاصل ہوا۔جس کے نتیجے میں ذہنی شکست اور پسپائی تقریباً تمام شعرا کے حصے میں آئی اوراس شکست اور پسپائی کا ردعمل یہ ہوا کہ ان پرجنسی رجحان کا غلبہ ہوگیااور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ یا تو بے ثباتی عالم کا ماتم کرنے لگےاوراس سے الگ ہوئے تو پھرتصوف اوراخلاق کا درس دینے لگے یا پھرمحبوب کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں پناہ ڈھونڈنے لگےاسی پرآشوب عہد میں نظیر نے بھی آنکھ کھولی مگرانہوں نے باوجوداس کے کہ اپنے عہد کااثر لیتے اوریاس اورقنوطیت کا

شکار ہو جاتے، اپنا دامن ان سب سے بچائے رکھا جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ نظیر نے نہ صرف اپنا رابطہ عوام سے برابر استوار رکھا بلکہ خود بھی اسی سماج کے ایک فرد بن گئے۔ اور چونکہ عوام کسی حال میں بھی پسپائیت کا شکار نہیں ہوتے اور پھٹے کپڑوں اور روکھی سوکھی روٹیوں پر بھی مسرور اور شاداں زندگی گزار لیتے ہیں۔ اس لئے نظیر نے بھی اپنے عہد کے حالات انتہائی نامسائل اور ناخوشگوار و ناسازگار ہونے کے باوجود خوش و خرم رہ کر زندگی گزاری اور اپنے زمانے کے مصائب و معائب کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہوئے بھی کبھی زندگی کا ماتم نہیں کیا۔

اس رویے کی وجہ سے اگر چہ ان خواص سے جو حالات کی چکی میں پس کر کراہ رہے تھے، وہ نزدیک نہ ہو سکے لیکن عوام نے انہیں اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نظیر کے کلام کا بیشتر حصہ ہم تک پہنچ نہیں پاتا۔ ان کے کلام کو پروفیسر عبدالغفور شہباز نے آگرہ کے اکثر پیشہ وروں، گداگروں اور نچلے طبقے کے ان لوگوں سے حاصل کیا جو نظیر کی وفات کے پچاس ساٹھ سال بعد بھی اپنے ذہن میں محفوظ کئے ہوئے تھے۔ نظیر کی شاعری کی اسی ادا نے ان کو اپنے عہد کے اور بعد کے بھی اکثر شعرا اور نقادوں کی نگاہوں سے گرا دیا۔ کیوں کہ بقول میکسم گورکی ''عوامی ادب کو جنم دینے یا پرکھنے کے لئے فن کار یا قاری کے لئے اسی سطح پر اتر کر زندگی کو دیکھنے اور بسر کرنے کی ضرورت ہے جس سطح پر عوام زندگی گزارتے ہیں'' نظیر نے اس سطح پر

اتر کر ایک عظیم عوامی فن کی تخلیق کر دی لیکن معاصرین یا بعد کے اثر فن کار اور نقاد اس سطح سے قطعاً نابلد تھے اس لئے نظیر کی شخصیت اور ان کا فن دونوں ان کے لئے بیکار ثابت ہوئے۔ ورنہ اس سے سیاسی اور سماجی انتشار اور بے کیفی کے زمانے میں جب سارے اردو شعرا محزونیت اور بے دلی کا شکار ہو چکے تھے نظیر ہی امید کی کرن بن کر درخشاں نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری رجائیت سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ جس کا سبب بقول نیاز فتح پوری یہ ہے کہ:-

''انہوں نے کبھی اس دنیا کو شیطان سے خدا کا انتقام نہیں سمجھا بلکہ انسان پر اس کا احسان سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے رہے اور تخیلات کی مصنوعی فضا میں پرواز کرنے کے بدلے حقیقت کی دنیا میں رہ کر امرت اور وش کے تجربے کرتے رہے۔''(۱)

جلال الدین جعفری نظیر کی شاعری کی گوناگوں خوبیوں کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

''دنیا میں جو تماشا ہو رہا ہے اسے وہ غور سے دیکھتا ہے اور اس لئے دیکھتا

---

(۱) ''نظیر: میری نظر میں''، نیاز فتح پوری، ''نگار''، نظیر نمبر ۱۹۴۰ء

ہے کہ دوسروں کو دکھائے۔ ساز ہستی سے جو آوازیں نکل رہی ہیں انہیں وہ کان لگا کر سنتا ہے اور اس لئے سنتا ہے کہ دوسروں کو سنائے۔ اس کی دور بین نظر ایسی تہہ تک پہنچ جاتی ہے جہاں دوسروں کی باریک بینی بیکار ہے۔ اس نے شاعری شروع کی تو دیکھا کہ شعرا کی بلند پروازیاں ہندوستان کے رسم و رواج، معاشرت، کاروبار اور زندگی سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتیں باوجود اس کے کہ شعرا کو ایران و توران اور عرب جانے کی توفیق نہیں ہوئی اور وہاں کے مناظر خواب میں بھی انہوں نے نہیں دیکھے۔ پھر بھی کوہ البرز و تاتار اور یمن و بدخشاں کے پیچ اگا رہے ہیں۔ بلبل و قمری اور کبک کے سوا اور کسی طائر پران کی نظریں نہیں پڑتیں۔ ہندوستان میں رہتے تو ہیں لیکن یہاں کے موسموں نے کوئی اثر ان کے شاعرانہ تخیل پر نہیں ڈالا۔ بہار کا وہ رنگ دکھاتے ہیں جو ان کے فرشتوں نے بھی نہ دیکھا۔ اس لئے اس نے ملک کی خصوصیات کی طرف توجہ کی۔ ملکی مناظر، ملکی طیور، ملکی موسم اور ملک کی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملات اور رسم و رواج واقعیت کے ساتھ نظم کی ہے۔ اس

میں اردو شعرا کی طرح زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے بلکہ
پیش پا افتادہ مضامین اس خوبی سے باندھے گویا آسمان سے تارے
اتارے ہیں۔''(۱)

جعفری صاحب نے اتنی ساری تعریف کے باوجود نظیر کی شاعری کی تمام خصوصیات کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے اس مقالے کے موضوع سے متعلق نظیر کی انفرادیت مختصر طور پر واضح کردی ہے۔ اگر ہم نظیر کی نظموں کے پس منظر کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی زیادہ تر نظموں کا پس منظر مقامی ثقافت، مقامی موسم، مقامی تہوار اور مقامی مذاہب و عقائد سے متعلق ہے جن میں انہوں نے زبان کا استعمال موضوعات کے لحاظ سے کیا ہے میں آئندہ سطور میں نظیر کی شاعری کے تاریخی پس منظر میں ان کی نظموں کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

نظیر کی نظموں کا ایک اہم پس منظر مقامی ثقافت ہے۔ ہندوستان کے کھیل تماشوں اور میلے ٹھیلے یہاں کی ثقافتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ سبھی مشاغل ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

---

(۱) ''نظیر کی شاعری کی خصوصیات''، جلال الدین جعفری، ''نگار''، نظیر نمبر، ص ۴۴

سے پہلے بھی موجود تھے۔ اور اس کے بعد بھی جاری رہے۔ البتہ مسلمانوں نے اس میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کیا اور رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول اس قدر بڑھا کہ تمام ثقافتی مشاغل میں یہاں کے تمام باشندے بلاتفریق مذہب وملت دل کھول کر حصہ لینے لگے۔ عہد نظیر میں آگرہ اور لکھنو جو دہلی سے بہت زیادہ دور نہ تھے ثقافتی مشاغل میں دارالسلطنت سے بہت زیادہ آگے بڑھ گئے کیوں کہ عہد مغلیہ کے اس دور انحطاط میں لکھنو اور آگرہ کو ان مصائب وآلام کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جس سے دلی اور یہاں کے عوام دوچار ہوتے رہتے تھے۔ اس صورت حال نے ثقافتی نقطہ نظر سے لکھنو اور آگرہ کو خوب پھولنے پھلنے کا موقع فراہم کیا۔ جہاں ایک سے ایک فنکار اور صنعت گر پیدا ہوئے۔ تفریحی مشاغل میں بھی لوگوں کی دلچسپی بڑھتی رہی۔ ان میں سے کچھ خواص اور زیادہ تر عوام کو بھی مرغوب ومحبوب تھے۔ نظیر کے عہد میں یہ ثقافتی مشاغل عروج پر تھے اور یقیناً نظیر کے ہم عصر شعرا اس سے واقف رہے ہوں گے یا ان میں سے بعض کا بہ چشم خود نظارہ بھی کیا ہوگا لیکن کسی نے اپنی شاعری میں ان کو نظیر کی طرح جگہ نہیں دی اس لئے کہ انہوں نے نظیر کا سا مزاج نہیں پایا تھا۔ نظیر ان کھیل تماشوں اور میلوں ٹھیلوں میں پوری دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور خوب لطف لیتے تھے۔ اس امر کا ثبوت ان نظموں سے ملتا ہے جو انہوں نے ''پتنگ بازی''، ''کبوتر بازی''، ''بلبلوں کی لڑائی''،

''ریچھ کا بچہ''، ''آگرے کی تیراکی''، ''بلدیو جی کا میلہ'' اور ''حضرت سلیم چشتی کا عرس'' وغیرہ عنوانات کے تحت قلمبند کی ہیں۔ پتنگ بازی صدیوں سے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کا ایک دلچسپ اور مرغوب کھیل رہا ہے۔ اگرچہ اب لوگوں کی دلچسپی اس سے بہت زیادہ نہیں رہی۔ لیکن عہد حاضر میں بھی ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر یا دیہات ہو جہاں پتنگ بازی کے موسم میں لوگ پتنگیں نہ اڑاتے ہوں۔ نظیر کے زمانے میں یہ آگرے کا نہایت پسندیدہ کھیل تھا بلکہ آگرے میں پتنگ بازی کا ایک میلہ لگا کرتا تھا جس کو ''مرجلہ'' کہتے تھے۔ اس میں پتنگ بازی کا مقابلہ ہوا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اس میلے کی صرف سیر ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں حصہ بھی لیتے تھے کیوں کہ پتنگ بازی پر لکھی گئی اپنی ایک نظم میں انہوں نے پتنگ کی کتنی قسمیں بیان کی ہیں جو آج بھی کسی ماہر ترین پتنگ باز کو حیرت میں ڈال سکتی ہیں۔ مثلاً دوبا، للیرا، لنگوٹیا، چاند تارا، پہاڑیا، بگلہ، دوتیا، دھیر، ابلق، گلہریا، دودھاریا، مانگ دار، خربوزیہ، دوکونیہ، چپ، ککڑیہ، گلسرا، چوکھرا، چچکا، کج کلاہ، تکل، جھجھاؤ وغیرہ پتنگوں کے نام اور قسمیں ہیں۔ جو رنگ اور سائز ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتے تھے۔ یہاں اس نظم کے چند بند پیش کرتا ہوں تاکہ پتہ چل سکے کہ نظیر اس مقامی کھیل میں تماش بین کا رول ادا کرتے تھے یا ایک منجھے ہوئے کھلاڑی کا:

لاتا ہے پھیر پھار کے تکل جو اپنی واں

کہتا ہے کوئی ان سے خبر دار ہو میاں

اب پیچ پڑنے کو ہے نہ دو اتنی ٹھمکیاں

گھبرا کے کنے اسکے نہ پھنسنے دو میری جاں

اچھا نہیں ہے مفت کٹانا پتنگ کا

گر پیچ پڑ گئے تو یہ کہتے ہیں دیکھیو

رہ رہ اسی طرح سے نہ اب دیجو ڈھیل کو

پہلے تو یوں قدم کے تئیں کو میاں رکھو

پھر ایک رگڑا دے کے ابھی اس کو کاٹ دو

ہے گا اسی میں فتح کا پانا پتنگ کا

اب پتنگ کے کٹنے اور اس کے لوٹے جانے کا منظر دیکھئے

کٹتا ہے جو پتنگ تو پھر لوٹنے اسے

دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے

کاغذ ذرا سا ملتا ہے یا ٹکڑے کانپ کے

جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر پڑے

پھر سوچئے تو کیا ہے ٹھکانہ پتنگ کا

آخری بند میں کٹی پتنگ کے پیچھے اس کو لوٹنے کے لئے بے تحاشا دوڑنے اور ہاتھ آجانے پر آپس میں کھینچا تانی سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور کسی کے کچھ کاغذ، کسی کے کانپ اور کسی کے کچھ ڈور ہاتھ آنے کی کیسی جاندار تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ نظم نظیر کے عوامی مزاج اور مشاہدہ کی دین ہے۔

یہی حال اس نظم کا جو نظیر نے ''کبوتر بازی'' پر لکھی ہے۔ آٹھ بند کی اس نظم میں انہوں نے کبوتروں کی تقریباً پچاس قسموں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً بصرئی، کابلی، شیرازی، چوہا، چندن، سبزے، مکھی، ششتر، اگر، طاؤسی، گل بوٹیے، نیلیے، گلی تھیٹر، لقے، چھتے، جوگیے، گھیرے، پٹیٹ، چپ تقتے، ماکھرے، زرچے، گل آنکھ، لل آنکھ، زردے، کابرے، توسی، پلکے، سیمابی، گھاگھرا، تمبولیے، پانی لال، اگرئی، سرمئی، عنبری، بھورے، مگسی، ہیرے، پسرے، کاسنی، لوٹن وغیرہ وغیرہ۔ اس نظم کے آخری دو بند ملاحظہ فرمائیں:

سیمابیے اور گھاگھرے تنبولئے پان لال

کچھ اگرئی اور سرمئی اور عنبری اور خال

بھورے مگس تا نبڑے، ببرے بھی خوش احوال

پھر مستر اور کاسنی لوٹن بھی سبک بال

کھولے ہیں گرہ دل کی گرہ باز کبوتر

کوا کرے جدھر کے تئیں چھپی کو ہلاویں

کچھ ہووے غرض پھر وہ اسی سمت کو جاویں

گٹی کو نہ پھڑکا ویں تو پھر تہ کو نہ آویں

چھوڑ ان کو نظیر اپنا دل اب کس سے لگاویں

اپنے تو لڑکپن سے ہیں دمساز کبوتر

کبوتر بازی اور بٹیر بازی کی طرح بلبلوں کے لڑانے کا رواج بھی لکھنؤ اور آگرے میں عام تھا۔ ان کی نظم بلبلوں کی لڑائی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کھیل میں مہارت رکھتے تھے۔ اس صداقت کے گواہ یہ اشعار ہیں:

کل بلبلیں جو نو دس قابو میں اپنے آئیں

اس میں سے دو پکڑ کر کشتی میں دھر بھڑائیں

یہ شور سن کے خلقت دوڑ آئی دائیں بائیں

کوئی بولا واہ حضرت کوئی بولا واہ سائیں

سوسوطرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں

اس ڈھب سے ہم نے یاروں کل بلبلیں لڑائیں

دس میں تو دونوں کٹ کٹ لڑتی تھیں کر کے گڈا

جب تیسری کو چھوڑا پھر تو ہوا تنگڈا

خلقت بھی آکے ٹوٹی چھوڑ اپنا اپنا اڈا

کڑکی کسی کی پسلی ٹوٹا کسی کا ہڈا

اس ڈھب سے ہم نے یاروں کل بلبلیں لڑائیں

جب لے چلے وہاں سے ہم بلبلوں کا لشکر

سب لوگ ہنس کے بولے اس دم دعائیں دے کر

سب میں میاں نظیر اب تم ہو بڑے قلندر

یہ کھیل آگرے میں اب ختم ہے تم ہی پر

اس ڈھب سے ہم نے یاروں کل بلبلیں لڑائیں

ان اشعار میں کچھ ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو آج ہمارے لئے نامانوس ہیں اور ہم کو

بار خاطر معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ وہ خاص اصطلاحیں ہیں جو عہد نظیر میں مشتمل تھیں اور جن کو استعمال کر کے مقامی رنگ کو اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ میں نے پوری نظم نقل نہیں کی ہے۔ کلیات میں اگر نظم کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے چوتھے بند میں اس مروجہ ترکیب کی طرف اشارہ ملتا ہے جو بلبلوں کی لڑائی میں شدت کے لئے کی جاتی تھی۔ نظیر نے ان کے ذریعہ نہ صرف مقامی رواجوں کی ترجمانی کی ہے بلکہ اس زمانے کی تمدنی تاریخ لکھنے والوں کے لئے تفصیلی معلومات بھی فراہم کر دی ہے۔

ریچھوں کو سدھا کر نچانے کا رواج بھی ہمارے ملک کا ایک قدیم دستور ہے۔ اس تماشے میں آج بھی خاص و عام کو دلچسپی ہے۔ آج بھی مداری اگر شارع عام پر ریچھ کے کرتب دکھاتے ہیں تو تماشائیوں کا ایک ہجوم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کئی اپنے کمزور اور دبلے بچوں کو ریچھ پر سوار کراتے ہیں اور اس کے چند بال تعویز کے ساتھ اس کی کمر میں باندھتے ہیں۔ نظیر کی نظم ''ریچھ کا بچہ'' کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تماشا اس زمانے میں بڑے اہتمام کے ساتھ دکھاتے تھے اور ریچھ کو ریشم کی ڈور میں باندھ کر رکھتے تھے۔ اس کی پیٹھ پر کامدار جھول پڑی ہوتی تھی۔ کانوں میں در، جھمکے، کرن پھول اور پاؤں میں کڑے کے علاوہ گھنگھرو بھی باندھ دیتے تھے۔ اس کا ناچ خاص و عام بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ نظیر کے اشعار میں آپ

اس کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں:

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر
ہاتھوں میں کڑے بجتے تھے سونے کے جھمگھر
کانوں میں در اور گھنگھرو پڑے پاؤں کے اندر
وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پر زر
جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچہ

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جس پہ کرن پھول
مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جوگل پھول
یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سدھ بھول
گویا کہ پری تھا وہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

اک طرف کو تھیں سینکڑوں لڑکوں کی پکاریں
اک طرف کو تھیں پیرو جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی قطاریں

غل ، شور ، مزے ، بھیڑ ، ٹھٹھ انبوہ، بہاریں

جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچہ

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس ناچ کا ایجاد

کرتا تھا کوئی قدرت خالق کے تئیں یاد

ہر کوئی یہ کہتا تھا خدا تم کو رکھے شاد

اور کوئی یہ کہتا تھا ارے واہ رے استاد

تو بھی جئے اور تیرا سدا ریچھ کا بچہ

نظیر کی نظموں کے تاریخی جائزے میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کسی بھی مذہب کی تاریخ میں ضابطہ وآئین ہی کو اصل مذہب بنالیا گیا ہے۔ جب کبھی تقلید وقدامت پرستی نے روح مذہب کو پامال کیا ہے،اس آفاقی یا محبت کے مذہب کے ماننے والے اسی مذہب میں سے پیدا ہوگئے ہیں۔ تاریخ مذاہب کا مطالعہ اس بات کو بھی واضح کردیتا ہے کہ شروع میں ہر مذہب بعض سادہ فطری حقیقتوں کو لے کرآتا ہے،مگر وقت کے ساتھ ساتھ ضابطہ بندی اور اگلوں کی لکیر ہی کو اصل مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔لیکن اگر ایک طرف اس مذہب میں یہ تقلید وقدامت پرستی بڑھتی رہتی ہے تو دوسری جانب اس مذہب کے پیروؤں میں روحانی ثقافت ( کلچر ) بھی پیدا ہوتی

رہتی ہے، اور یہ روحانی ثقافت جب ایک خاص سطح پر پہنچ جاتی ہے، تو اس مذہب کے ماننے والوں ہی میں سے بعض ہستیاں رونما ہو جاتی ہیں، یہ لوگ اس آفاقی مذہب کے معلم و مبلغ ہوتے ہیں اور اس مذہب والے اس ''بغاوت'' کو بھی اپنے مذہب کا جزو بنا لیتے ہیں۔

دنیا کے چند بڑے مذہبوں میں برہمنیت، بودھ مت، اور عیسویت مطمحی (Idealist) مذہب کہے جاتے ہیں، اس لئے ان کے اندر ترک و تیاگ ہی فلسفہ مذہب ہو گیا۔ بلکہ بودھ مت تو شروع ہی تیاگ سے ہوتا ہے۔ لیکن اسلام جو مطمحی نہیں بلکہ سراسر عملی مذہب ہے اور جس نے اپنے پیروؤں کو رہبانیت سے روکا ہے، اس کے اندر بھی تھوڑی ہی مدت میں تصوف داخل ہو گیا اور جزو مذہب بنا لیا گیا، شریعت و حقیقت، مذہب کے دو شعبے قرار پائے اور جس طرح اس آفاقی مذہب میں بھی دو فرقے ہوتے رہے ہیں اسی طرح اسلامی تصوف نے بھی سالک و مجذوب کی تقسیم مان لی۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ آفاقی مذہب صرف محبت کو مانتا اور اسماؤ علامات کو تسلیم نہیں کر سکتا ہے۔ اس مذہب کی تعلیم دینے والوں نے بیشتر شعراء کو اپنی تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بنایا اور ایشیا میں خصوصیت کے ساتھ متصوفانہ شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ وجود میں آ گیا، متصوفانہ شاعری کی تعریف میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانی طبع و مزاج پر حقیقت کے تصور کا ردعمل ہے۔ تصوف کی

تعلیم نے نوع انسان کو کچھ فائدہ پہنچایا، یا نہیں؟ اس کے جواب میں دونوں پہلوؤں پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن انسانی طبیعت کی ساخت کو دیکھتے ہوئے ''مذہب محبت'' کا پیغام ''آفاقی مذہب'' کی تعلیم، اپنی جگہ اٹل رہی اور رہے گی۔ اس زمانے میں مادہ پرستی کے زور نے کائناتی محبت کی تعلیم کو بہت کچھ مٹا دیا ہے، لیکن اس لئے کہ ''محبت'' کا پیغام ایک فطری اپیل ہے، آج کل کا انسان بھی جب اپنی حیوانیت اور درندگی سے تھک جائے گا تو امن وسکون کی تلاش میں وہ اس آفاقی مذہب کے اندر ہی پناہ پا سکے گا۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو نظیر واقعتاً ایک صوفی شاعر تھے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ اپنے فقیرانہ مشرب میں کس ہادی و مرشد کے پیرو تھے یا ان کا صوفی منش ہونا کس اثر کا نتیجہ تھا، اس وجہ سے دشوار ہے کہ نظیر کی زندگی کے حالات ہمارے سامنے نہیں ہیں اور جو بھی ہیں وہ بہت کم اور تقریباً غیر مستند۔ ان کے حالات زندگی اس قدر بھی محفوظ نہ کئے گئے جتنے دیگر معمولی سے معمولی شاعروں کے ہو گئے اور اس کی وجہ معلوم ہے کہ چونکہ وہ اپنے عہد کے معیار شاعری سے ہٹے ہوئے تھے، تقلید کو مٹانے والے تھے، تمام انسانوں کی بول چال میں عام باتیں کہتے تھے، اس لئے اشراف کا طبقہ ان کو اپنا نہ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس زمانے کے عام حالات پر قیاس کر کے نظیر کے کلام ہی سے استنباط کیا جائے۔

نظیر نے جب ہوش سنبھالا تو ایک طرف تو رومی وعطار، سعدی وحافظ، تلسی وکبیر اور نانک و سورداس کے نغموں سے فضا معمور تھی اور دوسری طرف تیموری خانوادے کی باجبروت سلطنت، اکبر اعظم کی عظیم الشان حکومت دم توڑ رہی تھی۔ یہ ماحول اگر ایک ذی حس اور صاحب بصیرت انسان کو عالم کی بے ثباتی کا سبق دے اور کائنات تخلیق سے محبت کرنا سکھا دے تو اچنبھے کی بات نہیں۔ اسلام میں قدامت پرستی اور تقلید عروج کو پہنچی ہوئی تھی اور یکے بعد دیگرے مذہب محبت کی منادی کرنے والے رونما ہوتے چلے آرہے تھے، نظیر کے ماحول نے ان کو بھی اسی آفاقی مذہب کے راستے پر ڈال دیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا نظیر متصوفانہ مزاج اور حکیمانہ نظر کے انسان تھے۔ لیکن وہ نہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے والے صوفی تھے اور نہ ساحل پہ کھڑے ہو کر موجوں کو گننے والے فلسفی، وہ تصوف کی زندگی جیتے اور فلسفے کے تریاق سے ''قید حیات'' کو گوارا بنا لیتے ہیں۔ وہ نہ تو ترک و تیاگ کرتے ہیں اور نہ زندگی کا رونا رو کر اپنے انسانی وسماجی فرض سے غافل ہو جاتے ہیں۔ بلکہ نظیر کا تاریخی شعور اس قدر بالیدہ ہے کہ انہوں نے عالم کی بے ثباتی پر اتنا زیادہ زور دیا ہے، جتنا کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں نہ ملے گا۔ وہ معرفت نفس کو جس دل نشین پیرائے اور عام فہم انداز میں سمجھاتے ہیں، دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔ اس بسیط وعظیم کائنات میں نظیر نے انسان

کے ہیچ و بے حقیت ہونے کو جس طرح سنایا ہے، نظیر ہی سنا سکتے تھے۔ وہ انسانی تفوق سے بیزار ہیں اور ''فرزندان الٰہی'' بلکہ کائنات خلقت کی کامل آزادی کے ماننے والے اور مبلغ ہیں۔

تصوف کے دو اصول اہم اور بنیادی ہیں۔ وحدت وجودی اور معرفت نفس۔ معرفت نفس کی تلقین کی پرواز دیکھئے:

جو تو کہتا ہے اے غافل ''یہ تیرا ہے نہ میرا ہے''
یہ جس کا ہے اسی کا ہے، نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
نمازی ہے، شرابی ہے، اچکا ہے، لٹیرا ہے
فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی، جن ہے
بلا ہے، بھوت ہے، یا من مزورا یا کمیرا ہے
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے
مسافر بے وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھیرا لے
تو اس کے بعد پھر کہیو ''یہ تیرا ہے یہ میرا ہے''

یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک

تجھے او بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

تو کچے سوت کا دھاگا، عبث بل پیچ کھاتا ہے

یہ سب وہم غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے

تو کیا جانے کہ تجھکو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے؟

تو کیا جانے کہ تجھ کو کس ایٹرن میں اٹیرا ہے

تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا اہا ہا ہا

مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے

ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے

اندھیرے میں اجالا ہے، اجالے میں اندھیرا ہے

طلسمات حقیقی ہے یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا

یہی چاند اور یہی سورج یہی شام اور سویرا ہے

نظیر اللہ، اس جہاں میں دم غنیمت ہے

کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

بالکل سامنے کی اور بالکل بے حقیقت چیزوں کی مثال سے انسان کی بے حقیقی ثابت کر کے نظیر کہتے ہیں کہ اب تم اس تماشے سے لطف لو۔ دنیا کے لیے ''طلسمات حقیقی'' کا نام وضع کر کے نظیر نے دفتر کے دفتر بیان کر دئے ہیں اور یہ کہہ کر کہ ہر شئے اپنی ضد کے اندر ہی مستور رہتی اور اسی میں سے ظاہر ہوتی ہے، سب کچھ سمجھا دیا ہے۔

اپنی ذات پر نظر کرنے کی تعلیم کے بعد نظیر بتاتے ہیں کہ عالم پر بھی نظر ڈالو:

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان

ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان

ایک اور دوسری جگہ، ذرا شاعرانہ رنگ میں گہری حقیقت بیان کرتے ہیں:

لے آئنے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ

صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ

خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ

زلف دراز و طرّۂ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل، تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے؟ جان ، ترا پاک صاف دل
اور خال کیا ہیں؟ تیرے سویدا کے رخ کے تل
زلف دراز ، فہم رسا سے رہی ہے مل
لاکھوں طرح کے رنج میں بھی ہم رہے ہیں مل
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

یہ آٹھ بند کا مسدس ہے۔ آخری بند یہ ہے:

باغ و چمن کے غنچۂ گل میں نہ ہوا اسیر
قمری کی سن نفیر ، نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے ارے نظیر
ہیں حرف من عرف کے یہی معنی ، اے نظیر
ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مذہب وملت کے اختلاف کو نظیر ایک واقعیت نگاری کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس حقیقت

پریقین رکھتے ہیں کہ مذہب پرستی ''پیدائش کا اتفاق'' ہے۔ جو خالق حقیقی کے طلب گار ہیں، وہ نہ ہندو ہو سکتے ہیں نہ مسلمان، اور نہ کوئی اور۔ راستوں کا فرق اور منزل کا ایک ہونا تصوف کا وہ نکتہ ہے جسے اکثر شعرا نہایت دل نشیں اسلوب میں بیان کر گئے ہیں۔ مگر اس نکتے کو نظیر فلسفے کی نظر سے دیکھتے اور بتاتے ہیں کہ مرنے کے بعد اختلاف مذہب نہیں رہتا یعنی وہاں ہندو، مسلمان اور عیسائی کا نام جانی بوجھی باتیں نہیں، وہاں اگر پوچھا جائے گا تو انسان یا خدا کا بندہ، بس انہیں ناموں سے پوچھا جائے گا۔ ذیل میں نظیر کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے، اسے پڑھئے اور نظیر کے فہم وادراک کی گہرائی تک پہنچئے:

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہے، نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم نے سماج کو جتنا پست کر دیا اور انسانیت کو جس قدر ذلیل کر

دیا، میرا خیال ہے کہ اسی احساس نے نظیر سے وہ نظم لکھوائی جس کا عنوان ''آدمی نامہ'' ہے۔اس نظم میں نظیر نے کسی شاعرانہ کمال کو نمایاں نہیں کیا ہے بلکہ امر واقعہ کو اس انداز سے پیش کر دیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس کے اندر چھپے ہوئے طنز کو اور آفاقی مذہب کی تعلیم کو سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظیر نے پوری نظم میں یہ نہیں کہا کہ شریف اور کمین اور نیچ برابر ہیں۔اس نے صرف یہ بتایا ہے کہ ہر ادنیٰ واعلیٰ اپنے اپنے کام میں لگا ہوا سماجی فرض ادا کر رہا ہے اور اس حقیقت سے الامر پر توجہ دلا کر نظیر نے فی المعنی بتایا ہے کہ سوچو تو کہ اتم اور نیچ کیا مفہوم ہے، بے کہے سمجھایا ہے کہ کیا زمانے کے نشیب وفراز سے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی ذات سے بری یا محفوظ سمجھ سکتا ہے۔اس نظم کی پرواز کچھ ایسی ہے کہ خیال اس طرف جائے بغیر نہیں رہتا کہ نظیر ذہنی انقلاب ہی کو اصل انقلاب سمجھتے ہیں اور اس انقلاب کے لئے وہ ان واقعیتوں کو پیش کرنا ضروری اور کافی سمجھتے ہیں جو ہماری خرابیاں بن گئی ہیں۔نظیر کا اسلوب مسلمہ طور پر دل میں گھر کر لینے والا اسلوب ہے جس کے تخاطب کے دائرے میں عامی بھی داخل ہیں۔ یہ نظم سولہ بند کا طویل مخمس ہے۔پوری نظم [آدمی نامہ] عدم مساوات کے شدید احساس کا اثر پیدا کرتی ہے اور انسان، انسان کے ساتھ جو بے انصافی کر رہا ہے، اس کی طرف سے دل میں ایک بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔

''مذہب محبت'' کی تلقین ہر صوفی شاعر نے کی اور کفر وایمان، دیر وحرم، مسجد وزنار کی تفریق

کوسب ہی نے حماقت کہا ہے، لیکن نظیر اس احساس کو جس طرح پیش کرتے ہیں وہ دوسروں کی طرح سطحی بات نہیں کہتے بلکہ خود ڈوب جاتے ہیں۔انہوں نے ہر مذہب کے مذہبی استعارے اور تلمیحات اس طرح لئے ہیں کہ اگر کرشن مہاراج کی تعریف کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بڑا کرشن بھگت دوسرا نہیں ہوسکتا ہے۔''کنہیا جی کے جنم'' کا پہلا بند ہے:

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی، جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں، ہر من بھیتر، سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات بتھا کی بھول ہے، جب بھولا بالا ہوتا ہے
آنند منڈلی باجت ، ہے، تت بھون اجالا ہوتا ہے

یوں پنچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر انکے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

بالپن کی بانسری کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ظاہر میں سب وہ نند جسودا کے آپ تھے
ورنہ وہ آپ مائی تھے، اور آپ ہی باپ تھے
پردے میں بالپن کے ، یہ ان کے ملاپ تھے

جوتی سروپ کہئے جنہیں ، سو وہ آپ تھے

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن

کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

سب مل کے یارو، کرشن مراری کی بولو جے

گوبند چھیل ، کنج بہاری کی بولو جے

دوہ چور کہاری ناتھ بہاری کی بولو جے

تم بھی نظیر کرشن بہاری کی بولو جے

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن

کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

بھیرو جی کی تعریف کا ایک بند دیکھئے:

دیکھا ہے جب سے میں نے تیرا جمال بھیروں

رکھتا ہوں دل میں تب سے، تیرا خیال بھیروں

دن رات ہے یہ میرا تجھ سے سوال بھیروں

تیری ہرن گہی ہے کر تو نہال بھیروں

اے پرتپال دیوت مدھ مست کال بھیروں

مدح گرونانک شاہ میں دیکھئے:

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں، وہ پورے ہیں آگاہ گرو

وہ کامل رہ بر جگ میں ہیں، یوں روشن جیسے ماہ گرو

مقصود، مراد، امید، سبھی برلاتے ہیں دل خواہ گرو

نت لطف وکرم سے کرتے ہیں، ہم لوگوں کا نرباہ گرو

اس بخشش کے، اس عظمت کے، ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو، اور ہر دم بولو، واہ گرو

مدح حضرت سلیم چشتیؒ سینے:

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے

حرمت ہے دوستوں کو حضرت تمہاری رو سے

یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے

رکھو نظیر کو تم ، دو جگ میں آبرو سے

اے موجد ہر احساں ، حضرت سلیم چشتی

منقبت امیر المومنین کا بھی ایک بند ملاحظہ ہو:

نور ظہور خالق اکبر کو کیا لکھوں

روح روان جسم پیمبر کو کیا لکھوں

دریائے معرفت کے شناور کو کیا لکھوں

دونوں جہاں کے گوہر انور کو کیا لکھوں

حیرت میں ہوں کہ گوہر صفدر کو کیا لکھوں

یہ مختصر اقتباسات اس اندازہ کے لئے کافی ہیں کہ نظیر ان لوگوں میں سے تھے جو ایک ہی وقت میں سکھ بھی ہیں اور ہندو بھی، سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، اور یہی محبت کا مذہب ہے۔

متصوفانہ موضوعات پر اظہار خیال میں نظیر کے یہاں کوئی خاص ندرت نہیں جو فارسی، اردو اور ہندی کلام میں نہ ملے، لیکن نظیر کا خلوص مقصد اور خلوص شعری، مخصوص چیز ہے، جو کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ چند شعر پیش ہیں:

فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے

انہیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب

یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی

بکھرنا ، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جا نا

یہ یکتائی ، یہ یک رنگی ،تس اوپر یہ قیامت ہے

نہ کم ہونا، نہ بڑھنااور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

جدھر کو دیکھو ادھر آپ ہی جھمکتا ہے

مزا پڑے نہ اسے کیوں کہ شیش محلوں کا

پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اسی کے رو بہ رو

اس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا

ہمہ اوست یا وحدت وجود سے متعلق یہ چند شعر آپ نے پڑھے۔اب ادراک باری تعالیٰ کے متعلق نظیر کیا کہتے ہیں ،اسے بھی سن لیجئے:

وصف اس کے حسن کا کس سے ہوا کلی ،مگر

جتنا جس کے فہم میں آیا ، کہا ، اچھا کہا

اور تخلیق کائنات کو نظیر نے کس طرح سمجھا ہے، وہ بھی سنیے:

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر

سوتے تھے، عشق نے مگر آکر جگا دیا

اور

عشق میں اس گوہر نایاب کے

آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

''منشائے قدرت'' اور ''اختیار انسانی'' کی حقیقت نظیر کی نظر میں یہ ہے:

میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اسکے ہاتھ میں

چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا ادھر بڑھا دیا

محو تدبیر ہیں ہم، لیک خدا ہی جانے

کون سا گل ہے پس پردہ تقدیر کھلا

فرض انسانیت کی شناخت نظیر نے کس طرح کی ہے:

جس کام کو جہاں میں، آیا تھا تو نظیر

خانہ خراب! تجھ سے وہی کام رہ گیا

انسانی فطرت، فطرت بسیط سے واصل ہو جانے کی ہر دم آرزومند رہتی ہے، اس کو نظیر کس شوق کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے

کہ مثل آتش افسردہ ہے دل پھر کچھ چلا کمہلا

دنیا کی دل کشیوں اور اس کی حقیقت کو نظیر نے اس طرح سمجھا ہے:

ہے جواہر خانۂ دنیا جو یہ با آب و تاب

اہل صورت کا ہے دریا، اہل معنی کا سراب

نظیر اپنی بشریت کا علاج کس طرح کرتے ہیں:

نظیر آگے ہوس تھی ہم کو کفن کی

جو سوچا تو آخر کو دیوانہ پن تھا

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ نظیر کے گرد و پیش ان کی پوری سوسائٹی تھی۔ وہ سوسائٹی جس کے قویٰ قدامت پسندی، تنگ نظری اور بدمذاقی کی فولادی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان زنجیروں کو صرف انقلاب کی آگ ہی پگھلا سکتی تھی۔ اس لئے نظیر کے کمال کو انقلاب کا انتظار کرنا پڑا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ:

## ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

تغیر ایک ایسی مرئی حقیقت ہے جو ہر قدم پر بہ جبر اپنا احساس کراتی ہے۔ خیالات، محسوسات، مراسم، معاشرت، ذوق، وجدان، حکومت، سیاست ــــ مختصر یہ کہ زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ، تغیر کے اثر سے محفوظ نہیں۔ قدروں کا تغیر، زندگی کے تنوع کا باعث اور ترقی کی معجز نمائی کا ذمہ دار ہے۔ سیاست کا وسیع میدان تغیر کی محبوب آماجگاہ ہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں اس کی سحر کاریاں اتنی متحیر نہیں کرتیں، جتنا ادبیات کے دائرے میں کرتی ہیں۔ تغیر سیاست کی فطرت کا جزو ہے، لیکن جب اس کا جادو، فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب کی دنیا میں چلتا دیکھتے ہیں تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ ادب کے معیار اٹل اور قدریں مستقل ہونی چاہئیں، لیکن نشو و نما کے اصول بتاتے ہیں کہ ادبی قدریں بھی گھٹتی بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ اس خصوص میں سیاست اور ادب ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں، لیکن ایک نازک مگر بین فرق موجود ہے جس سے ادبیات کی فطری عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جب سیاسی قدریں بدلتی ہیں تو اتراشحنہ مردک کہلاتا ہے اور مہاتما شیطان بن کر رہ جاتا ہے، لیکن ادب کے مندر کا پجاری کبھی مردود نہیں ٹھہرتا۔ ایک نوع کے ادب کا دور ختم ہونے پر دوسرے کے علم بردار پہلے مبلغوں کو متہم نہیں کرتے، کم سے کم ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ مذاق کا تغیر انہیں صرف کہنگی کے غلاف میں لپیٹ کر طاق نسیاں پر رکھ دیتا ہے

اور بس ۔ ان دونوں صورتوں کی مثال حسن اتفاق سے ایک ہی ذات میں جمع ہے۔ مسلم سوشلسٹ جماعت سر سید کو ایک سیاسی رہ نما کی حیثیت میں آج غدار بتاتی ہے۔ لیکن طرز تحریر میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جانے اور سر سید کا انداز نگارش مسلماً نامطبوع ہو جانے کے بعد بھی کوئی نقاد سر سید کی انشا کو بد نیتی یا گمرہی کی پیداوار نہیں بتاتا۔

چنانچہ قدروں کا تغیر جب ادبیات کے سمندر میں شدید تلاطم برپا کرتا ہے تو مقبول گم نام اور گم نام مقبول ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی ہو کر نہیں رہ جاتا، اس سے اہم تر نتائج رونما ہوتے ہیں۔ بعض ایسی ہستیاں منظر عام پر آجاتی ہیں جن کی صحیح اہمیت کا اندازہ کبھی کیا ہی نہیں گیا بلکہ جس کے احساس کی اہلیت ہی سرے سے مفقود ہوتی ہے۔ یہ وہ جواہر ہوتے ہیں جو تعصّبات کی کثافت جل چکنے کے بعد اپنی تابانی سے نگاہوں کو روشن اور قلبوں کو منور کر دیتے ہیں۔

ہمارا عہد، انقلاب کا عہد ہے۔ تغیر کا آوازہ بلند ہے۔ دقت نظر ہر ادارے کا جائزہ لے رہی ہے۔ اعتقاد و عقیدت مندی کی فرسودہ راہوں سے ہٹ کر نقد و بصیرت کی جدید شاہراہیں بنائی جا رہی ہیں۔ قدریں بدل رہی ہیں ۔ چھان بین ، قطع و برید کا بازار گرم ہے۔ پرانے معیاروں کے بوسیدہ ایوان ڈھا کر تحقیق تجسس کی پختہ بنیادوں پر نئے خیالات کے حیات پرور محل تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ معاشرت و معتقدات کے پہلو بہ پہلو جب اردو ادب کا احتساب کیا جاتا

ہے تو نشاط حیات کا جلوہ مفقود اور توہمات کے دوش بہ دوش، تصنع، روایت پرستی اور یاس نوازی کا بھیانک منظر بے نقاب ہوتا ہے۔ غائر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ خود وہ کسوٹی جس پر ہم کھوٹا کھرا پرکھنے کے عادی رہے ہیں معطل ہو چکی ہے۔ جمود کی سمت نے ذوق کی رگ و پے میں سرایت کر کے امتیاز اور فیصلے کی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے۔ پیمانے آب حیات کی جگہ زہر آب سے لب ریز ہیں۔ زندگی کے نغمے کے بام سے موت کا نوحہ پڑھا جا رہا۔ بقائے حیات کی ایک یہی تدبیر رہ گئی تھی کہ کسوٹی ریزہ ریزہ اور پیمانے چور کر دئے جائیں چنانچہ اہل نظر اس پر مجبور ہوئے اور فوری تغیر رونما ہوا۔ جب نئے معیار پر پرکھا گیا تو رائج الوقت سکوں کی کثیر تعداد، جس پر صحت و سند کے طغرے کندہ تھے، جنس کاسد نکلی۔ اہم شخصیتیں، جن کی اہلیت مسلم اور شہرت لازوال سمجھی جاتی تھی، پست و لایعنی نظر آئیں اور ٹکسال باہر ہو گئیں۔ نقد کے امتحان میں سوائے معدودے چند کے کوئی پورا نہ اترا۔ لیکن اس الٹ پلٹ نے یہ کارفرمائی کی کہ ان شخصیتوں پر جنہیں زمانے نے فراموش کر رکھا تھا، نگاہیں پڑنے لگیں۔ ڈھونڈنے والوں کی بلند پروازیوں سے وہ حسین ترین پھول نہ چھپ سکے، جو سب سے اونچی چوٹی پر کھلے ہوئے تھے، آخر افق بعید پر گمنامی و کسمپرسی کے کالے بادلوں کے اندر، ایک سورج کی دھندلی شعاعیں جھلکنے لگیں۔ زمانے کی جوہر ناشناسی کا غبار ایک صدی سے زیادہ کی مسلسل کوشش میں نظیر کا شاعرانہ جمال چھپائے نہ چھپا سکا۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر محمد شاہ کے عہد سے اس عہد کی ابتدا تک، جسے تاریخ دور مستقبل میں عہد انقلاب کہے گی، گمنام رہا۔ اس کی گمنامی اس کی شخصیت شیکسپیر کی زندگی کے حالات کی طرح ایک عظیم الشان راز ہے، جس کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ یہ گم نامی اس شخصیت کی گم نامی ہے جسے ایک صدی سے زیادہ کی طویل بے اعتنائی صفحہ ہستی سے مٹانے اور ذہنوں سے محو کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ان کے مورخوں کی عدم توجہی اور نقادوں کے استہزا کے باوجود جس شاعر کا کلام مسلمہ نام وروں کے دوش بہ دوش درس میں داخل، بے نواؤں اور گداگروں کو حفظ اور مثالوں اور کہاوتوں کے طور پر ورد زبان ہو، جس کی پوری پوری نظمیں عطف و اضافت کی صحت کے ساتھ، ستر اور اسی برس کے ناخواندہ بوڑھوں کو یاد ہوں اور جو انہیں تھرک تھرک کر عام جلسے میں گانا آج بھی فخر سمجھتے ہوں، جس کے صرف نام سے بسنت کے جشن میں دو ہزار ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی فرقہ وارانہ کش مکش کے اس ملعون دور میں جمع ہو جائیں، جس کی قبر پر عقیدت مند جہلا چراغی چڑھا کر منت مانگیں اور اہل نظر پرستار پھولوں کے ہار، گجرے چڑھائیں، اس کی گم نامی ضرور ایک اہم راز ہونی چاہیئے۔ اگر آپ اردو زبان کے شاعروں کی کلیات، دیوان اور منتخبات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخے جمع کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہیں کہ سب سے زیادہ متنوع اشاعتوں میں کس کا کلام مفید ہے تو آپ کو سر دفتر اسی گم نام شاعر کا نام ملے گا جسے مغرب کے مبصروں نے اردو کا

واحد شاعر تسلیم کیا ہے۔ ان شہادتوں کے بعد آپ حیرت میں پڑ کر نظیر کی گمنامی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ نظیر کے باب میں گم نامی کا لفظ اصل میں ایک اضافی لفظ ہے جو صرف نظیر کی ذات کی نسبت سے اپنے اندر معنی رکھتا اور اپنے مفہوم کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ شہرت کی جو مقدار، نام نہاد گم نامی میں، نظیر کا حصہ رہی وہ کسی بڑے شاعر کے لئے مباہات کا موجب بن سکتی ہے، لیکن خود نظیر کی ذات کے لئے گم نامی کی مترادف ہے۔ شہرت کے عام معنی میں نظیر پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت عام امتیازات کی دسترس سے بالاتر ہے۔ دوسرے شاعروں کی نام وری کی حدیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں سے نظیر کی ابتدا ہوتی ہے۔ نظیر کو جب گمنام کہا جائے تو مطلب یہ سمجھنا چاہئے کہ بہ قدر کمال اس کی فطانت کی داد نہیں دی گئی۔

نظیر کی شاعری میں شروع سے آخر تک وہ عنصر چھایا ہوا ہے جس کو ''روح عصر'' (zeitgeist) کہتے ہیں اور جدید اصول تنقید کی رو سے جس کے بغیر ادب صحیح معنوں میں ادب نہیں ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ عنصر کم ہے اور جس قدر ہے وہ اتنے پردوں میں ہے کہ اس کو پہچاننا اور نام زد کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کا کلام پڑھ کر اس کے زمانے کی معاشرت اور سماجی حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ہاں اگر شاعر قصیدہ گو ہوا تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس بادشاہ کے زمانے میں تھا، یا کس امیر کے دربار سے توسل رکھتا تھا۔ برخلاف

اس کے نظیر کا کلام اپنے وقت اور اپنے ماحول کا آئینہ ہے۔ واقعات وحالات اور رسوم وروایات کی جیسی زندگی سے معمور تصویریں نظیر نے ہم کو دی ہیں وہ اردو شاعری کے حصے کی چیزیں نہیں تھیں۔ ایسی مرقع نگاری میر حسن اور میر انیس کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ ایسے مرقعے تو کچھ انگریزی شاعری کے مورث اعلیٰ چاسر ہی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ یہ محاکاتی قدرت کچھ چاسر ہی کو نصیب ہوئی تھی۔ فرق یہ ہے کہ چاسر نے ہر طبقہ اور ہر جماعت کی تصویریں اتاری ہیں، نظیر نے اس کا کوئی اہتمام نہیں رکھا اور جمہور کی روزمرہ کی زندگی سے واسطہ رکھا، وہ اسی کو زندگی سمجھتے تھے جو کثیر تعداد اور وسیع سے وسیع دائرے پر احاطہ کرے۔ اگر اولیت کے اعتبار سے ولی کو اردو شاعری کا چاسر کہنا چاہئے تو مماثلت کے اعتبار سے نظیر اردو شاعری کے چاسر ہیں۔ نظیر جس چیز یا جس واقعے کو بیان کرتے ہیں، اس کی ہو بہو تصویر اتار کر رکھ دیتے ہیں، جیسے اصل کا ایک مثنیٰ کر دیا ہو، آگرے کی تیراکی کا جو نقشہ نظیر نے کھینچا ہے، اس کا لطف اس وقت بھی خوانچے والوں سے لے کر شہر کے رئیسوں تک ہر وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو ایک گزرے ہوئے زمانے اور ایک اٹھی ہوئی رسم کو ابھی ایک دم نہ بھول گیا ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ نظیر جیسی واقعہ نگاری چاسر کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ چاسر اتنی وسیع واقفیت اور متنوع موضوع کہاں سے لاتا؟ نظیر کی زندگی ہی ایسی گزری کہ ان کے تجربات اور

معمولات کا اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہونا لازمی تھا۔ نظیر نے اپنا دائرہ موضوع کسی خاص فرقہ کی زندگی تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے نہ اپنی زندگی میں مذہب اور مشرب کو کوئی اہمیت دی اور نہ شاعری میں۔ سب جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کے بیشتر اوقات ہندوؤں میں گزرے۔ اس کے اور اسباب جو کچھ بھی ہوں، مگر اہم سبب یہ ضرور تھا کہ نظیر جمہور پرست تھے اور ان کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ مذہبی امتیازات بھی سماج کے مدارج کی طرح، خواص کے پھیلائے ہوئے فساد ہیں۔ نظیر نے ہندوؤں کے رسوم و روایات کی طرف زیادہ توجہ رکھی اس لئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی معاشرت کے غالب عناصر یہی ہیں۔ نظیر نے یوں تو حمد، نعت، معجزہ حضرت علی اور معجزہ حضرت عباس وغیرہ موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب محض برائے بیت ہیں، ان میں وہ جان نہیں ہے جو ''کنہیا جی کے جنم''، ''بانسری''، ''ہر کی تعریف''، ''مہادیو جی'' کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ نظیر کا قلم انہیں چیزوں میں جان پیدا کر سکتا تھا جن سے ان کے ملک کی عام زندگی میں جان تھی اور جن سے حرکت و عمل پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ آپ ساری کلیات نظیر پڑھ جایئے، صرف ایک نظم ''عید الفطر'' کے بیان میں ملے گی اور اس میں وہ زور و کیفیت اور بے ساختگی نہیں ہے جو ''دیوالی''، ''ہولی''، ''بلدیو جی کا میلا'' میں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ ہولی کے بیان میں لکھتے ہیں:

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گل رو، رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ نازوادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو، اور کانوں، میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو، تال چھنکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں، وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو، اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ، ہرآن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو، بے ہوشی ہو، ''بھڑوے'' کی منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی، بھڑوا بکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اسی ہولی کا دوسری جگہ یوں نقشہ کھینچتے ہیں:

یا سوانگ کہوں، یا رنگ کہوں، یا حسن بتاؤں ہولی کا
سب ابرن تن پر جھمک رہا ، اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا، دکھلانا سج دھج شوخی کا

ہر گالی ، مصری ، قند بھری، ہر ایک قدم اٹکھیلی کا

دل شاد کیا اور موہ لیا ، یہ جو بن پایا ہولی نے

ہر جا گہہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گل کاری ہے

اور ڈھیر عبیروں کے لاگے، سو عشرت کی تیاری ہے

ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے

منہ سرخی سے گل نار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے

یہ روپ جھلتا دکھلایا ہے ، یہ رنگ دکھایا ہولی نے

''دیوالی'' کا یہ جشن دیکھئے:

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا

ہر اک طرف کو اجالا ہوا دوالی کا

''راکھی'' سے چند بند ملاحظہ ہوں:

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی

سنہری سبز ریشم زرد اور گل نار کی راکھی

بنی ہے گو کہ نا در خوب ہر سردار کی راکھی

سلونوں میں عجب رنگیں ہے، اس دلدار کی راکھی

نہ پہنچے ایک گل کو یار جس گل زار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو

ہراک گلرو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں، خوش ہو

ہوس جو دل میں گزرے ہے، کہوں کیا آہ میں تم کو

یہی آتا ہے جی میں، بن کے باھمن، آج تو یارو

میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے

تو ان کی راکھیوں کو دیکھ، اے جاں چاو کے مارے

پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اپر بارے

نظیر آیا ہے، باھمن بن کے، راکھی باندھنے پیارے

بندھالو اس سے تم ہنس کر، اب اس تیوہار کی راکھی

ان نظموں میں سب سے زبردست خصوصیت وہ انسانی انداز اور واقعیت ہے جس کی مثالیں اردو تو خیر ایک طرف، دوسری زبانوں میں بھی کم ہی ملتی ہیں، ہمارے مدعیان فضیلت نے

نظیر کی اس انسان پرستی کو سوقیت اور ابتذال کہہ کر بدنام کرنا چاہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مدت تک نظیر کی طرف توجہ کرنے کی لوگوں کی ہمت نہیں ہوئی۔ مگر حقیقت کے اوپر اگر پردہ ڈالا جائے تو زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتا۔ اس وقت بھی لوگوں کو احساس تھا کہ نظیر اردو شاعری میں ایک نئے امکان اور ایک نئی قوت کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ البتہ اس وقت مذاق اور معیار کے اجارہ داروں کا رعب کچھ ایسا طاری تھا کہ کوئی زبان سے وضع اور عادت کے خلاف کسی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب ہماری زندگی میں نئی قدریں اور نئے معیار پیدا ہو گئے ہیں، اور ہمارے مذاق اور میلانات بندشوں سے آزاد ہو رہے ہیں۔ اب ہم کو صحیح احساس ہو رہا ہے کہ نظیر نے اردو شاعری کو کیا دیا اور اب ہم اس کا اعتراف بھی کر رہے ہیں۔ نظیر نے اردو میں خارجی اور واقعی شاعری کا امکان پیدا کیا اور اس کو ایک جمہوری چیز بنا کر پیش کیا۔

نظیر کا حق مارنے کی ہمارے شاعروں اور نقادوں نے بڑی کوشش کی مگر حق بھی کبھی نہ کبھی حق دار کو پہنچ ہی جاتا ہے۔ بظاہر نظیر ہم کو اپنے تنہا رنگ کے تنہا شاعر نظر آتے ہیں جن کی نہ کسی نے تعریف کی نہ تقلید۔ لیکن غائر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نظیر کا اثر آئندہ نسلوں پر کتنی دور تک ہوا ہے، بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری نے جو نیا جنم لیا ہے اور نظم نگاری کی جو تحریک چلی ہے اس میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر نظیر کا اثر برابر کام کرتا رہا ہے۔ حالی اور آزاد، جو جدید

نظم اردو کے دو زبردست معیار ہیں، نظیر سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں تو یہ اثر اور بھی واضح اور نمایاں ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہماری زبان میں اگر ''ریچھ کا بچہ''، ''کورا برتن''، ''تندرستی نامہ''، ''اوس''، ''موسم زمستاں''، ''برسات کی بہاریں''، ''بنجارہ نامہ''، ''ہنس نامہ''، ''مفلسی''، وغیرہ نظمیں موجود نہ ہوتیں تو ''برکھارت''، ''مناظرۂ رحم وانصاف''، ''اسلم کی بلی''، ''دال'' اور حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی اسی قسم کی نظمیں ابھی نہ جانے کتنی دیر بعد ہم کو پڑھنے کو ملتیں اور ان کے راستے میں نہ جانے کیا کیا دقتیں ہوتیں۔ اس کو مانتے ہوئے ہماری طبیعت ہچکچاتی ہے، اس لئے کہ حالی سے لے کر اس وقت تک اردو کے نظم نگاروں کا اسلوب عموماً نظیر کی یاد نہیں دلاتا۔ نظم میں بھی اسی فضیلت شاہی کا رواج چلا جو غزل اور قصیدہ میں چلتا رہا، اور غیر ملکی عناصر ہماری شاعری میں کم وبیش اسی طرح غالب رہے، لیکن حالی کی، ''برکھارت''، ''مناجات بیوہ''، ''شکوۂ ہند'' اور اسمٰعیل میرٹھی کی اکثر نظموں میں نظیر کا کافی رنگ ہے، جوان شاعروں کے اپنے اپنے انفرادی رنگ کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے بعد اردو نظم کے آمر اقبال ہوئے جو فطرتاً ایک مفکر شاعر تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ جب تک فارسیت میں پناہ نہ لیں اپنے خیالات کو، جو ایک خاص سطح سے تھے، ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر چہ وہ اپنے نغمے کو ہندی بتاتے ہیں، مگر ان کی زبان میں ہندی عنصر اور الفاظ کی جتنی کمی ہے شاید ہی کسی دوسرے اردو شاعر

میں ہو۔ایک عرصے تک وہ اردو نظم کے قائد اعظم رہے اور نظم نگاروں کی نئی نسل ان کی تقلید کو اپنے لئے فخر سمجھتی رہی۔لیکن گزشتہ بیس برس کے اندر اردو شاعری میں کافی انقلابی آثار پیدا ہو گئے ہیں اور اب ہم اپنی شاعری کے رواجی معیار کو اپنی نئی زندگی اور اس کے نئے میلانات اور نئے مطالبات کے لئے ناقص پا رہے ہیں۔اب ہم کو احساس ہو رہا ہے کہ ہم کیسی دینا کے کس حصہ میں ہیں اور کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس احساس کا اثر ہماری شاعری پر بھی نمایاں طور پر پڑ رہا ہے۔ہماری شاعری کے معیار اور اسلوب بدل رہے ہیں۔اس وقت اگر کوئی شاعر ہم پر صحت بخش اثر ڈال سکتا ہے تو وہ نظیر اکبرآبادی ہیں۔

ہماری شاعری میں اب بھی واقعیت کے مقابلہ میں تخیلیت اور جمہوریت کے مقابلے میں انفرادیت کا عنصر ناگوار حد تک غالب ہے۔اپنے حال میں مبتلا رہنا اور اپنے نفس کے اندر کھو جانا اردو شاعری کا مزاج ہو گیا ہے اور اب اس کو اس طلسمی حصار سے باہر لانے کے لئے نظیر ہی جیسے رہبر کی ضرورت ہے جو ہم کو خارجیت کی طرف لے جاتا ہے اور آنکھیں کھول کر خدا کی وسیع دنیا سے کیف اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ساری اردو شاعری میں ہم کو نظیر ہی کی ایک ہستی ملتی ہے جو اپنے نفس کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہیں ہے۔یہ محض میرا دعویٰ نہیں ہے، میں خلا میں باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ بالکل نئی نسل کے ان شاعروں کو پڑھئے جو جمہوریت اور انقلابیت

کی طرف مائل ہیں تو ان کو آپ نظیر سے قریب تر پائیں گے، اگر چہ ایسے شاعروں کی تعداد ابھی تک بہت کم ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک شاعر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا ہے، مجھے حیرت تھی کہ احسان دانش کے یہاں ایسی بے لاگ خارجیت کہاں سے آئی جس کا اردو شاعری میں ان سے پہلے پتہ نہیں چلتا۔ سچی بات یہ ہے کہ احسان دانش نے اگر کسی شاعر کا غور اور شوق سے مطالعہ کیا ہے تو وہ نظیر ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ تفصیلی واقعیت اور یہ اضطراری عمومیت نظیر ہی کی دین ہو سکتی تھی۔ احسان دانش اردو شاعری میں بالکل نئے امکانات کا پتہ دینے والے شاعر ہیں جن کا ابھی نظیر ہی کی طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور انہوں نے ہم کو ان امکانات کو کام میں لانے کا ڈھنگ بھی بتا دیا ہے۔ ان کی شاعری اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اردو شاعری کیا ہو سکتی ہے اور آئندہ وہ کیا ہوگی۔ جو شاعری کہ ''باغی کا خواب'' بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہو وہ کیا نہیں ہو سکتی اور کیا نہیں کر سکتی، بشرطیکہ اس کو ایک تنگ و تاریک قفس سے نکل کر کھلے میدان میں آنے کی اجازت دے دی جائے۔

مختصر یہ کہ نظیر اکبر آبادی محمد شاہ کے عہد سے اس عہد کی ابتدا تک، جسے تاریخ دور مستقبل میں عہد انقلاب کہے گی، گمنام رہا۔ اس کی گمنامی، اس کی شخصیت شیکسپیئر کی زندگی کے حالات کی طرح ایک عظیم الشان راز ہے، جس کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکا اور لوگوں کے لئے اس

کا سمجھنا ضروری بھی نہیں ہے۔ یہ گمنامی اس شخصیت کی گمنامی ہے جسے ایک صدی سے زیادہ کی طویل بے اعتنائی صفحہ ہستی سے مٹانے اور ذہنوں سے محو کرنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ان کے مورخوں کی عدم توجہی اور نقادوں کے استہزا کے باوجود جس شاعر کا کلام مسلمہ نام وروں کے دوش بدوش درس میں داخل، بے نواؤں اور گداگروں کو حفظ اور مثالوں اور کہاوتوں کے طور پر ورد زبان ہو، جس کی پوری پوری نظمیں ستّر اور اسّی برس کے ناخواندہ بوڑھوں کو یاد ہوں اور جو انہیں تھرک تھرک کر آج بھی عام جلسے میں گانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہوں، جس کے صرف نام سے بسنت کے جشن میں دو ہزار ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی فرقہ وارانہ کشمکش کے اس ملعون دور میں جمع ہو جائیں، جس کی قبر پر عقیدت مند جہلا چراغ چڑھا کر منت مانگیں اور اہل نظر پھولوں کے ہار اور گجرے چڑھائیں، اس کی گمنامی ضرور ایک اہم راز ہونی چاہیے۔

نظیر ایک ایسے اہم راز ہیں جس کو سمجھنے کے لئے اس عہد کی پوری تاریخ اور اس تاریخ تک نظیر کی رسائی پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر فنکار اپنے تاریخی وسیاسی، معاشرتی واخلاقی ماحول کی مخلوق ہوتا ہے، ماحول کا اثر موافق اور مخالف دونوں صورتوں میں رونما ہوسکتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی ایک ایسے فنکار ہیں جن سے ادب کی ایک نئی تاریخ جنم لیتی ہے۔

000

# اختتامیہ

گذشتہ اوراق میں اس بات کا ذکر آ چکا ہے کہ نظیر مغلیہ سلطنت کے عہد زوال کے شاعر تھے۔ انہوں نے لمبی عمر پائی تھی اس لئے ۱۷۳۵ء سے ۱۸۳۰ء تک کے تمام اردو شعرا کے ہم عصر رہے اور یہی وہ دور تھا جس میں مغلیہ سلطنت کا انحطاط اپنی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گزر چکا تھا۔ اس دور کی افراتفری نے تقریباً تمام شعرا کو ذہنی طور پر بے حد متاثر کیا جس کے نتیجے میں وہ یاس اور قنوطیت کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں اکثر چونکہ درباروں سے وابستہ تھے اس لئے عوام سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ لیکن اسی دور ابتلا میں نظیر ایک ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے خود کو قنوطیت اور مایوسی سے بچائے رکھا۔ وہ فطری طور پر ایک جمہور پسند انسان واقع ہوئے تھے اس لئے عوام کی دلچسپیوں اور مشاغل حیات میں دل کھول کر شریک رہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا ان کی مسرت کو اپنی مسرت سمجھتے رہے۔

نظیر نے اپنے عہد کی یاس انگیز کیفیتوں کا بہت کم اثر لیا۔ جہاں اردو کے اکثر شعرا

انفرادیت کی تنگ وتاریک کوٹھری میں قید تھے وہاں یہ اجتماعیت کے دریا میں تیرا کی کرتے رہے اور آزادی کے آسمان پر پرواز کرتے رہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے خود کو پوری طرح ہندوستانی رنگ میں رنگ لیا۔ ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کا گہرا شعور بھی ان کی شاعری میں رچ بس گیا۔ ان کی یہ ادا بالقصد نہیں تھی بلکہ یہ ان کا مزاج تھا اور ان کے اس مزاج کا ثبوت ہم کو ان کی نظموں کے مزاج سے مل جاتا ہے۔ انہوں نے موضوعات کی تلاش میں دور دراز ممالک کا ذہنی سفر نہیں کیا بلکہ آنکھوں دیکھے موضوعات پر ہی نظمیں لکھتے رہے۔ ان کا مشاہدہ اگرچہ آگرہ تک ہی محدود تھا لیکن یہ مشاہدہ مکمل اور پکا تھا۔ وہ بائیس کی عمر میں دہلی سے آگرہ آگئے تھے اور پھر ساری زندگی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جہاں سے باہر جانے کے مواقع بھی آئے۔ لیکن آگرہ کو چھوڑنا انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ متھرا اور برندابن تک گئے، جو آگرہ سے قریب تھے۔ آگرہ کے چپہ چپہ سے ان کی واقفیت مکمل تھی۔ یہاں کے خواص کے عادات و خصائل سے بالعموم اور عوام کے رہن سہن طور طریق اور مشاغل سے بالخصوص وہ پوری طرح آگاہ تھے۔ عوام سے ان کا رشتہ بہت استوار تھا۔ آگرہ بھی چونکہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا اس لئے آگرہ کی جن اشیا اور وہاں کی جن کیفیتوں کو اپنے کلام میں پیش کیا وہ ہندوستان کے اکثر مقامات کی اشیا یا کیفیات سے مختلف نہ تھیں۔ اس لئے نظیر کے بیانات کے آئینے میں ہندوستان کے افراد

اور ماحول کی تصویر بہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

نظیر کی نظموں کے موضوعات کی وسعت کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے نظیر نے ہندوستانی تہواروں، ہندوستانی موسموں، ہندوستانی مذہبی رسموں اور کھیل تماشوں کے علاوہ ہندوستانی اشیا پر نظمیں لکھیں۔ ان میں سے بعض موضوعات پر ان کے پیش رووں اور بعد کے شاعروں کے یہاں بھی نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن نظیر کی ہر نظم میں جو تفصیل ہے وہ کہیں دستیاب نہیں۔ وہ اپنے موضوعات کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے، کیوں کہ ان کے مشاہدے میں جتنی وسعت ہے وہ کسی اور کو بھی نصیب نہیں۔ متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شاعر اس معاملے میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے آسمان پر تنہا درخشندہ ستارہ ہیں۔

نظیر کے بعد کے شاعروں نے اگر چہ ان سے استفادہ کیا لیکن نظیر نے اپنے موضوعات کو جس قدر ہندوستانی رنگ میں رنگا ہے اس سے آگے جانا تو درکنار، وہ اس رنگ کو قائم بھی نہ رکھ سکے۔ اس لئے اس وصف میں نظیر آج بھی بے نظیر ہیں۔ اس لئے کہ وہ خالص ہندوستانی شاعر تھے اور ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ گرد و پیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے تھے اور انہیں

سے اپنی نظموں کے لئے مواد حاصل کرتے تھے۔ نظیر اردو کے وہ شاعر ہیں جن کے کلام سے ہندوستان کے حالات، عام معاشرت اور یہاں کے رسم ورواج سے متعلق معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

نظیر کے کلام میں از اول تا آخر وہ عناصر موجود ہیں جن کو ہم روح عصر کہتے ہیں اور جن کے بغیر صحیح معنوں میں ادب ادب نہیں ہوسکتا۔ نظیر کے علاوہ اردو کا کوئی دوسرا شاعر ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کے کلام کو پڑھ کر اس کے عہد کی معاشرت اور سماجی حالات کا اس حد تک اندازہ لگایا جاسکے۔ نظیر کا کلام دراصل اپنے وقت اور ماحول کا آئینہ ہے۔ مکمل واقعات وحالات اور رسوم و روایات کی جیسی تصویریں نظیر سے ہم کو ملی ہیں وہ اردو شاعری کے حصے کی چیز معلوم نہیں ہوتیں۔ ایسی تصویر کشی اردو کے کسی شاعر کے بس کی بات نہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نظیر کی شاعری کے موضوعات، ہندوستانی عوام کے محسوسات، تجربات اور دلچسپیوں کے ایسے سامان اپنے اندر رکھتے ہیں جن سے خود نظیر بھی آئے دن دوچار ہوتے رہتے تھے۔ ایسے محسوسات، تجربات اور دلچسپیوں سے اردو کے دوسرے شعرا بھی دوچار ہوتے رہے۔ لیکن نظیر کی طرح ان سے متاثر ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ نظیر ہندوستانی ماحول کے ایک مخصوص رنگ میں جذب ہو چکے تھے۔ اس لئے اس سے اثر پذیر ہو کر

اس کی حقیقی ترجمانی کردی اور آنے والے اردو شعرا کے لئے مشعل ہدایت بن گئے۔ ان کے بعد کے شعرا ان سے کما حقہٗ فائدہ محض اس لئے نہ اٹھا سکے کہ غزل کی دلکشی اور مقبولیت نے انہیں اتنا متاثر کر دیا تھا کہ وہ اسی سے اپنا دامن کسی طرح نہ چھڑا سکے اور غزل کی جامعیت اور اختصار کے عادی ہونے کی وجہ سے نظیر کی وسعت اور تفصیل تک نہ پہنچ سکے۔

نظیر پر یہ ایک الزام ہے کہ ان کے کلام میں خواہ وہ مقامی رنگ سے ہی متعلق کیوں نہ ہو حقیقت کی بے رنگ ترجمانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ الزام ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخیل کی رنگ آمیزی سے حسن کلام میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی افراط سے صداقت کے اظہار میں دشواری پیش آتی ہے اور بعض اوقات اس پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ مقامی رنگ سے متعلق بیشتر اردو شعرا کے کلام میں نمایاں خامی یہی رہی ہے کہ ان کے تخیلی رویے کی وجہ سے مقامی رنگ مصنوعی یا پھیکا ہو گیا ہے۔ نظیر کے طرز اظہار میں اگرچہ تخیل کی رنگ آمیزی عموماً کم ہے لیکن جب انہوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے تو وہ اس معاملے میں بھی پیچھے نہیں رہے ہیں بلکہ ان کے کلام میں مصورانہ اور محاکاتی کیفیت تو ایسی ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیان کردہ کیفیتوں کا مشاہدہ ہم بچشم خود کر رہے ہیں۔

مقامی رنگ کی پیش کش میں نظیر کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات پر اشعار کہنے کے لئے زبان بھی موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کی ہے۔ چونکہ ان کے موضوعات عوامی تھے اس لئے زبان بھی ایسی رکھی کہ عوام آسانی سے سمجھ کر لطف اندوز ہوسکیں چنانچہ عوامی الفاظ اور محاورات کی کثرت کے باعث اکثر اوقات ہم کو ان میں سے بعض کے معنی یا مطلب کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے لیکن ہماری اس دشواری کو ایک عام آدمی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ زبان کے معاملے میں نظیر کے اس رویہ نے نہ صرف اردو الفاظ کے ذخیرے میں حیرت انگیز طور پر اضافہ کر دیا بلکہ اردو کو ایک عوامی زبان بنا دیا۔ اس حیثیت سے موجودہ صدی میں جو کاوشیں عمل میں آئیں ہیں اس کا آغاز نظیر نے اٹھارہویں صدی ہی میں کر کے اسے بہت آگے بڑھایا۔ عہد حاضر کے ایک معروف شاعر احسان دانش نے ان کی ہندوستانیت کا جو اثر لیا ہے اور اس کا اعتراف جس طرح کیا ہے وہ مجنوں گورکھپوری کی زبانی سنئے :-

”مجھے حیرت تھی کہ احسان دانش کے یہاں ایسی بے لاگ خارجیت اور مقامی رنگ کہاں سے آیا۔ میری حیرت کو خود احسان دانش نے دور کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اگر کسی شاعر کا غور اور شوق سے مطالعہ کیا ہے تو وہ نظیر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تفصیلی واقفیت اور

اضطراری عمومیت نظیر ہی کی دین ہے۔احسان دانش اردو شاعری میں
بالکل نئے امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔جس کا جائزہ ابھی نہیں لیا گیا ہے
اور انہوں نے ہم کو ان امکانات کو کام میں لانے کا ڈھنگ بھی بتا دیا
ہے۔ان کی شاعری اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اردو شاعری
کیا ہو سکتی ہے اور آئندہ وہ کیا ہوگی۔"(۱)

احسان دانش کا شمار اردو کے اہم ترین نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے تو کھلے دل سے اپنے اوپر نظیر کے اثرات کا اعتراف کر لیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اعتراف نہ کرنے کے باوجود اردو کے دوسرے معروف نظم نگار شعرا نے بھی منظر نگاری، مقامی رنگ اور واقفیت کے اعتبار سے نظیر کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول کیا ہے۔یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ چونکہ نظیر کی طرح خود کو ہندوستانی ماحول میں جذب نہیں کر سکے اس لئے نظیر سے آگے جانا تو کجا اس معاملے میں نظیر تک بھی نہیں پہنچ پائے۔لیکن میں اب بھی مایوس نہیں ہوں اس لئے مستقبل کے شعرا سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ نظیر سے استفادہ کر کے اردو شاعری میں مقامی رنگ کو فروغ دیں گے۔اور اس لحاظ سے

---

(۱) "نظیر اکبرآبادی: اردو شاعری میں واقفیت اور جمہوریت کا آغاز"، مجنوں گورکھپوری

اس کو دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کی صف میں شامل ہونے کے لائق بنائیں گے۔

اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کرتا چلوں کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ بعنوان ''نظیر اکبرآبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ'' تمہیدی کلمات، اختتامیہ اور کتابیات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول ''نظیر اکبرآبادی کا عہد'' ہے۔ اس باب میں نظیر کے احوال و آثار بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی نظیر کے سن پیدائش اور جائے پیدائش سے بحث کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کس طرح عوام کے درمیان پروان چڑھی، اس وقت دلی سے لے کر آگرہ تک کا ماحول کیا تھا اور نظیر نے اپنے ماحول سے کیا کچھ لیا اور اپنے ماحول کو کیا کچھ دیا، مختصراً اس کا بھی ذکر آیا ہے۔ نظیر ایک ایسے شاعر تھے جنہیں نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں سے بھی ہمدردی و موانست تھی۔ جس کا اثر ان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر ہر طرح نمایاں نظر آتا ہے۔

اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ نظیر اکبرآبادی اور ان کے عہد کے معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی منظر نامے پر روشنی ڈالی جائے کہ نظیر اکبرآبادی کے عہد کے معاشرتی و معاشی نیز ثقافتی پس منظر سے قارئین کرام کو کماحقہ واقفیت حاصل ہو جائے اور نظیر شناسی کا باب مزید روشن ہو سکے۔

نظیر کے احوال و آثار کی فراہمی میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کی کتاب ''زندگانی بے نظیر'' اور عبدالباری آسی کے مرتب کردہ ''کلیات نظیر اکبرآبادی'' کے مقدمے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس سلسلے میں حد درجہ معاون، مستند اور معتبر ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسری کتابیں بھی معاون و مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ نظیر کی زندگی کے مطالعے میں بھی ان کے تاریخی شعور کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

باب دوم کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی قسمیں'' ہے۔ نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں عوام دوستی اور انسانی ہمدردی کے موضوعات پیش ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض نظموں میں ہندوستانی لوک کلچر کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ بعض نظمیں وہ ہیں جن میں فطرت کی متنوع تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی منظومات بھی جابجا دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن میں نظیر کا صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ ایسی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشی، سادگی اور رواداری، امن اور شانتی کے جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور جزا و سزا کے نکتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظیر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ہندو کلچر اور معتقدات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اپنی نظموں میں نظیر ان موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن میں پند و نصیحت سے کام

لیا گیا ہے۔ ایسی نظموں میں خاص طور پر فکری اور فلسفیانہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ باب دوم ایک بھرپور باب ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی بعض نظموں کا پس منظر'' ہے۔ اس باب میں نظیر کی اہم اور چنندہ نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ نظیر کی نظموں کے پس منظر کو جاننے کے لئے ان کے عہد اور ماحول کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''تاریخی واقعات تک نظیر کی فنکارانہ رسائی'' ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس باب میں نظیر کے تاریخی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کس طرح نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کو اجاگر کیا ہے اور کس انداز سے اپنے عہد میں جیتے ہوئے تاریخی واقعات تک فنکارانہ رسائی دکھائی ہے، اس کا اپنی بساط بھر اس باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی طرح زیرنظر باب ''اختتامیہ'' ہے۔ اس باب میں گذشتہ چاروں ابواب کا نچوڑ یا ماحصل پیش کیا گیا ہے تا کہ ان چند صفحات کے مطالعہ سے کوئی بھی باذوق قاری پوری تحقیق کے مزاج و معیار کا اندازہ لگا سکے۔

سب سے آخر میں ان کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کتابوں سے میں نے تحقیق کے دوران استفادہ کیا ہے۔اس فہرست میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے مطالعے سے اس موضوع کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا۔

000

# کتابیات

◊

| شمار | کتاب | مصنف/مرتب | اشاعت |
|---|---|---|---|
| [۱] | کلیات نظیر اکبر آبادی | عبدالباری آسی | ۱۹۵۱ء |
| [۲] | زندگانی بے نظیر | عبدالغفور شہباز | ۱۹۵۱ء |
| [۳] | اردو ادب کی تنقیدی تاریخ | سید احتشام حسین | ۱۹۸۳ء |
| [۴] | تنویر ادب | صغیر احمد جان | ۱۹۸۰ء |
| [۵] | حرف ادب | شجاعت علی سندیلوی | ۱۹۷۸ء |
| [۶] | گلزار نظیر | سلیم جعفر | ۱۹۹۱ء |

[۷] تاریخ ادب اردو — وہاب اشرفی — ۲۰۰۷ء

[۸] اردو ادب کی تاریخ — تبسم کاشمیری — ۲۰۰۶ء

[۹] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — سلیم اختر — ۲۰۰۰ء

[۱۰] ادب اور زندگی — مجنوں گورکھپوری — ۱۹۸۴ء

[۱۱] سہ ماہی ''ادیب''علی گڑھ — جلد۱۲،شمارہ۴ — ۱۹۸۸ء

[۱۲] نظیر شناسی — اکبر علی بیگ/محمد علی اثر — ۱۹۸۷ء

[۱۳] نظیر اکبر آبادی — علی احمد فاطمی — ۱۹۸۳ء

[۱۴] حکایت ہند — تاراچرن — ۱۹۶۴ء

[۱۵] تاریخ اہل ہند — ڈاکٹر تاراچند — ۱۹۶۱ء

[۱۶] تاریخ ادب اردو (جلد سوم) — جمیل جالبی — ۲۰۰۶ء

[۱۷] تاریخ ادب اردو (جلد دوم) — وہاب اشرفی — ۲۰۰۷ء

[۱۸] نظیر نامہ — شمس الحق عثمانی — ۱۹۷۹ء

[۱۹] اردو کی عوامی روایت چہار بیت کے حوالے سے — شکیل جہانگیری — ۱۹۹۸ء

[۲۰] اتر پردیش کے لوک گیت — اظہر علی فاروقی — ۱۹۸۷ء

[۲۱] اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو — یونس اگاسکر — ۱۹۷۸ء

[۲۲] اردو میں لوک ادب — قمر رئیس — ۱۹۸۹ء

[۲۳] نظیر اور انسان — مخمور اکبرآبادی — ۱۹۳۸ء

[۲۴] نظیر: میری نظر میں — نیاز فتح پوری — ۱۹۴۰ء

[۲۵] نظیر کی شاعری کی خصوصیات — جلال الدین جعفری — ۱۹۴۰ء

[۲۶] نظیر اکبرآبادی اور مشترکہ کلچر — رشیدہ کوثر — ۱۹۹۸ء

[۲۷] نظیر اکبرآبادی کی جمالیات — شکیل الرحمٰن — ۲۰۰۳ء

[۲۸] نظیر اکبرآبادی — محمد حسن — ۱۹۹۴ء

[۲۹] نظیر اکبرآبادی: بحیثیت عوامی شاعر — طاہرہ پروین — ۲۰۰۷ء

[۳۰] نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر سید آل ظفر ۲۰۰۸ء

[۳۱] دیوان نظیر فرحت اللہ بیگ ۱۹۵۸ء

[۳۲] روح نظیر مخمور اکبرآبادی ۱۹۸۸ء

000

Barkat Ali
(Supervisor)

**Dr. Barkat Ali**
Head, Dept. of Urdu
M. L. S. M. College
Darbhanga

Md. Fahim Rabbani
(Researcher)

**4. Research coverage - theme and area**

The research work will cover all the available nazms of Nazir particularly in the light of "Kulliyat-e-Nazir Akbarabadi" compiled by Dr.Shujaat Ali Sandelwi. As the theme is to project the socio-political and cultural scenario of the age, the nazms based on the contemporary realities will be critically assessed to achieve the goal.

**5. Contribution of research work to the discipline of Urdu language and literature**

As the literature is a finer blend of history, this research work, when completed will throw the colourful light on the pages of history specially in the context of Agra- the capital of India during the period of Akbar. The expected colourful light of socio-plitico-cultural scenario may substantiate or contribute to the Medieval Indian history to some extent.

**6. Methodology to be adopted**

The required and relevant matter will be extracted from the nazms of Nazir and assessed in respect of the topic and content. Then they will be placed under the related chapters. The works will be basically subjective and primary sources will play a vital role in it.

**7. Work design (tentative plan of proposed research work**

To find out the desired result, the research work will be divided into the following four chapters:-

# Synopsis for Ph.D.degree in Urdu

**Name of researcher:** Md.Fahim Rabbani

**Name of supervisor:** Dr.Barkat Ali, MLSM College, DBG.

## 1. Title of research work

**A STUDY OF NAZIR AKBARABADI'S HISTORICAL NAZMS**

## 2. Statement of the research problem

Shaikh Md.Wali alias Nazir Akbar Abadi ( 1740-1830) was a stalwart of Urdu Nazms. Although, he composed magnificent Ghazals too, the history of Urdu literature has acclaimed his name and fame as a great Nazm writer. This is an established point that his contribution to Urdu Nazm is more valuable as well as unparallel.

Nazir touched a number of topics right from the Indian festivals to religions personalities. He was a great admirer of almost all the natural and social facts which reflect Indianess is his Nazms. His Nazms have been analysed from different angles but the nazms which depict the contemporary political, social, cultural and religious realities have not been assessed meaningfully uptill now.

Therefore, this research work will be contained to such nazms.

## 2. Objective of research

The main objective of this research work is to study Nazir's nazms which are based in historical facts of the age and project a socio-political and cultural scenario which emerges from within the nazms artistically.

# A STUDY OF NAZIR AKBARABADI'S HI STORICAL NAZMS

Thesis Submitted

for Ph. D.

in Urdu (2010)

L. N. MITHILA UNIVERSITY, KAMESHWARANAGAR

DARBHANGA

*Supervisor*

**Dr. Barkat Ali**

Head, Dept. of Urdu

M.L.S.M. College, Darbhanga

Bihar

*Scholar*

**Md. Fahim Rabbani**

At + P.O. : Mohiuddinpur Pakri

Via : Benipur, Darbhanga

Bihar

# نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ



تحقیقی مقالہ

برائے پی ایچ ڈی

للت نارائن متھلا یونیورسیٹی، دربھنگہ

۲۰۱۰ء

نگراں

**ڈاکٹر برکت علی**

ایم اے (ڈبل) پی ایچ ڈی (پی یو)

صدر شعبۂ اردو، ایم ایل ایس ایم کالج

ضلع: دربھنگہ (بہار)

ریسرچ اسکالر

**محمد فہیم ربانی**

موضع: محی الدین پورپکری

ضلع: دربھنگہ (بہار)

# اختتامیہ

گذشتہ اوراق میں اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ نظیر مغلیہ سلطنت کے عہد زوال کے شاعر تھے۔انہوں نے لمبی عمر پائی تھی اس لئے ۱۷۳۵ء سے ۱۸۳۰ء تک کے تمام اردو شعرا کے ہم عصر رہے اور یہی وہ دور تھا جس میں مغلیہ سلطنت کا انحطاط اپنی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گزر چکا تھا۔ اس دور کی افراتفری نے تقریباً تمام شعرا کو ذہنی طور پر بے حد متاثر کیا جس کے نتیجے میں وہ یاس اور قنوطیت کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں اکثر چونکہ درباروں سے وابستہ تھے اس لئے عوام سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ لیکن اسی دور ابتلا میں نظیر ایک ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے خود کو قنوطیت اور مایوسی سے بچائے رکھا۔ وہ فطری طور پر ایک جمہور پسند انسان واقع ہوئے تھے اس لئے عوام کی دلچسپیوں اور مشاغل حیات میں دل کھول کر شریک رہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا ان کی مسرت کو اپنی مسرت سمجھتے رہے۔

نظیر نے اپنے عہد کی یاس انگیز کیفیتوں کا بہت کم اثر لیا۔ جہاں اردو کے اکثر شعرا

انفرادیت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں قید تھے وہاں یہ اجتماعیت کے دریا میں تیرا کی کرتے رہے اور آزادی کے آسمان پر پرواز کرتے رہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے خود کو پوری طرح ہندوستانی رنگ میں رنگ لیا۔ ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کا گہرا شعور بھی ان کی شاعری میں رچ بس گیا۔ ان کی یہ ادا بالقصد نہیں تھی بلکہ یہ ان کا مزاج تھا اور ان کے اس مزاج کا ثبوت ہم کو ان کی نظموں کے مزاج سے مل جاتا ہے۔ انہوں نے موضوعات کی تلاش میں دور دراز ممالک کا ذہنی سفر نہیں کیا بلکہ آنکھوں دیکھے موضوعات پر ہی نظمیں لکھتے رہے۔ ان کا مشاہدہ اگر چہ آگرہ تک ہی محدود تھا لیکن یہ مشاہدہ مکمل اور پکا تھا۔ وہ بائیس کی عمر میں دہلی سے آگرہ آگئے تھے اور پھر ساری زندگی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جہاں سے باہر جانے کے مواقع بھی آئے۔ لیکن آگرہ کو چھوڑنا انہوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ متھرا اور برندابن تک گئے، جو آگرہ سے قریب تھے۔ آگرہ کے چپہ چپہ سے ان کی واقفیت مکمل تھی۔ یہاں کے خواص کے عادات و خصائل سے بالعموم اور عوام کے رہن سہن طور طریق اور مشاغل سے بالخصوص وہ پوری طرح آگاہ تھے۔ عوام سے ان کا رشتہ بہت استوار تھا۔ آگرہ بھی چونکہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا اس لئے آگرہ کی جن اشیا اور وہاں کی جن کیفیتوں کو اپنے کلام میں پیش کیا وہ ہندوستان کے اکثر مقامات کی اشیا یا کیفیات سے مختلف نہ تھیں۔ اس لئے نظیر کے بیانات کے آئینہ میں ہندوستان کے افراد

اور ماحول کی تصویر بہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

نظیر کی نظموں کے موضوعات کی وسعت کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے نظیر نے ہندوستانی تہواروں، ہندوستانی موسموں، ہندوستانی مذہبی رسموں اور کھیل تماشوں کے علاوہ ہندوستانی اشیا پر نظمیں لکھیں۔ ان میں سے بعض موضوعات پر ان کے پیش روؤں اور بعد کے شاعروں کے یہاں بھی نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن نظیر کی ہر نظم میں جو تفصیل ہے وہ کہیں دستیاب نہیں۔ وہ اپنے موضوعات کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑتے، کیوں کہ ان کے مشاہدے میں جتنی وسعت ہے وہ کسی اور کو بھی نصیب نہیں۔ متقدمین و متاخرین میں سے کوئی شاعر اس معاملے میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے آسمان پر تنہا درخشندہ ستارہ ہیں۔

نظیر کے بعد کے شاعروں نے اگر چہ ان سے استفادہ کیا لیکن نظیر نے اپنے موضوعات کو جس قدر ہندوستانی رنگ میں رنگا ہے اس سے آگے جانا تو درکنار، وہ اس رنگ کو قائم بھی نہ رکھ سکے۔ اس لئے اس وصف میں نظیر آج بھی بے نظیر ہیں۔ اس لئے کہ وہ خالص ہندوستانی شاعر تھے اور ہندوستان کی زندگی اور ہندوستان کے رسوم و روایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ گرد و پیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے تھے اور انہیں

سے اپنی نظموں کے لئے مواد حاصل کرتے تھے۔ نظیر اردو کے وہ شاعر ہیں جن کے کلام سے ہندوستان کے حالات، عام معاشرت اور یہاں کے رسم ورواج سے متعلق معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

نظیر کے کلام میں از اول تا آخر وہ عناصر موجود ہیں جن کو ہم روح عصر کہتے ہیں اور جن کے بغیر صحیح معنوں میں ادب ادب نہیں ہوسکتا۔ نظیر کے علاوہ اردو کا کوئی دوسرا شاعر ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کے کلام کو پڑھ کر اس کے عہد کی معاشرت اور سماجی حالات کا اس حد تک اندازہ لگایا جاسکے۔ نظیر کا کلام دراصل اپنے وقت اور ماحول کا آئینہ ہے۔ مکمل واقعات وحالات اور رسوم و روایات کی جیسی تصویریں نظیر سے ہم کو ملی ہیں وہ اردو شاعری کے حصے کی چیز معلوم نہیں ہوتیں۔ ایسی تصویر کشی اردو کے کسی شاعر کے بس کی بات نہیں۔

اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نظیر کی شاعری کے موضوعات، ہندوستانی عوام کے محسوسات، تجربات اور دلچسپیوں کے ایسے سامان اپنے اندر رکھتے ہیں جن سے خود نظیر بھی آئے دن دوچار ہوتے رہتے تھے۔ ایسے محسوسات، تجربات اور دلچسپیوں سے اردو کے دوسرے شعرا بھی دوچار ہوتے رہے۔ لیکن نظیر کی طرح ان سے متاثر ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ نظیر ہندوستانی ماحول کے ایک مخصوص رنگ میں جذب ہوچکے تھے۔ اس لئے اس سے اثر پذیر ہوکر

اس کی حقیقی ترجمانی کردی اور آنے والے اردو شعرا کے لئے مشعل ہدایت بن گئے۔ ان کے بعد کے شعرا ان سے کما حقہٗ فائدہ محض اس لئے نہ اٹھا سکے کہ غزل کی دلکشی اور مقبولیت نے انہیں اتنا متاثر کر دیا تھا کہ وہ اسی سے اپنا دامن کسی طرح نہ چھڑا سکے اور غزل کی جامعیت اور اختصار کے عادی ہونے کی وجہ سے نظیر کی وسعت اور تفصیل تک نہ پہنچ سکے۔

نظیر پر یہ ایک الزام ہے کہ ان کے کلام میں خواہ وہ مقامی رنگ سے ہی متعلق کیوں نہ ہو حقیقت کی بے رنگ ترجمانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ الزام ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخیل کی رنگ آمیزی سے حسن کلام میں تو اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی افراط سے صداقت کے اظہار میں دشواری پیش آتی ہے اور بعض اوقات اس پر ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ مقامی رنگ سے متعلق بیشتر اردو شعرا کے کلام میں نمایاں خامی یہی رہی ہے کہ ان کے تخیلی رویے کی وجہ سے مقامی رنگ مصنوعی یا پھیکا ہو گیا ہے۔ نظیر کے طرز اظہار میں اگر چہ تخیل کی رنگ آمیزی عموماً کم ہے لیکن جب انہوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے تو وہ اس معاملے میں بھی پیچھے نہیں رہے ہیں بلکہ ان کے کلام میں مصورانہ اور محاکاتی کیفیت تو ایسی ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیان کردہ کیفیتوں کا مشاہدہ ہم بچشم خود کر رہے ہیں۔

مقامی رنگ کی پیش کش میں نظیر کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات پر اشعار کہنے کے لئے زبان بھی موقع ومحل کے لحاظ سے استعمال کی ہے۔ چونکہ ان کے موضوعات عوامی تھے اس لئے زبان بھی ایسی رکھی کہ عوام آسانی سے سمجھ کر لطف اندوز ہوسکیں چنانچہ عوامی الفاظ اور محاورات کی کثرت کے باعث اکثر اوقات ہم کو ان میں سے بعض کے معنی یا مطلب کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے لیکن ہماری اس دشواری کو ایک عام آدمی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ زبان کے معاملے میں نظیر کے اس رویہ نے نہ صرف اردو الفاظ کے ذخیرے میں حیرت انگیز طور پر اضافہ کر دیا بلکہ اردو کو ایک عوامی زبان بنا دیا۔ اس حیثیت سے موجودہ صدی میں جو کاوشیں عمل میں آئیں ہیں اس کا آغاز نظیر نے اٹھارہویں صدی ہی میں کر کے اسے بہت آگے بڑھایا۔ عہد حاضر کے ایک معروف شاعر احسان دانش نے ان کی ہندوستانیت کا جو اثر لیا ہے اور اس کا اعتراف جس طرح کیا ہے وہ مجنوں گورکھپوری کی زبانی سنئے :-

> ''مجھے حیرت تھی کہ احسان دانش کے یہاں ایسی بے لاگ خارجیت اور مقامی رنگ کہاں سے آیا۔ میری حیرت کو خود احسان دانش نے دور کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اگر کسی شاعر کا غور اور شوق سے مطالعہ کیا ہے تو وہ نظیر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تفصیلی واقفیت اور

اضطراری عمومیت نظیر ہی کی دین ہے۔احسان دانش اردو شاعری میں
بالکل نئے امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔جس کا جائزہ ابھی نہیں لیا گیا ہے
اور انہوں نے ہم کو ان امکانات کو کام میں لانے کا ڈھنگ بھی بتا دیا
ہے۔ان کی شاعری اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اردو شاعری
کیا ہو سکتی ہے اور آئندہ وہ کیا ہو گی۔''(۱)

احسان دانش کا شمار اردو کے اہم ترین نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے تو کھلے دل سے اپنے اوپر نظیر کے اثرات کا اعتراف کر لیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اعتراف نہ کرنے کے باوجود اردو کے دوسرے معروف نظم نگار شعرا نے بھی منظر نگاری، مقامی رنگ اور واقفیت کے اعتبار سے نظیر کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ چونکہ نظیر کی طرح خود کو ہندوستانی ماحول میں جذب نہیں کر سکے اس لئے نظیر سے آگے جانا تو کجا اس معاملے میں نظیر تک بھی نہیں پہنچ پائے۔لیکن میں اب بھی مایوس نہیں ہوں اس لئے مستقبل کے شعرا سے یہ امید رکھتا ہوں کہ وہ نظیر سے استفادہ کر کے اردو شاعری میں مقامی رنگ کو فروغ دیں گے۔اور اس لحاظ سے

---

(۱) ''نظیر اکبر آبادی: اردو شاعری میں واقفیت اور جمہوریت کا آغاز''، مجنوں گورکھپوری

اس کو دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کی صف میں شامل ہونے کے لائق بنائیں گے۔

اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کرتا چلوں کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ بعنوان ''نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ'' تمہیدی کلمات، اختتامیہ اور کتابیات کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول ''نظیر اکبر آبادی کا عہد'' ہے۔ اس باب میں نظیر کے احوال و آثار بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی نظیر کے سن پیدائش اور جائے پیدائش سے بحث کی گئی ہے۔ ان کی شخصیت کس طرح عوام کے درمیان پروان چڑھی، اس وقت دلی سے لے کر آگرہ تک کا ماحول کیا تھا اور نظیر نے اپنے ماحول سے کیا کچھ لیا اور اپنے ماحول کو کیا کچھ دیا، مختصراً اس کا بھی ذکر آیا ہے۔ نظیر ایک ایسے شاعر تھے جنہیں نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں سے بھی ہمدردی و موانست تھی۔ جس کا اثر ان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر ہر طرح نمایاں نظر آتا ہے۔

اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ نظیر اکبر آبادی اور ان کے عہد کے معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی منظر نامے پر روشنی ڈالی جائے کہ نظیر اکبر آبادی کے عہد کے معاشرتی و معاشی نیز ثقافتی پس منظر سے قارئین کرام کو کما حقہ واقفیت حاصل ہو جائے اور نظیر شناسی کا باب مزید روشن ہو سکے۔

نظیر اکبر آبادی کی تاریخی نظموں کا ایک مطالعہ

نظیر کے احوال و آثار کی فراہمی میں پروفیسر عبدالغفور شہباز کی کتاب ''زندگانی بے نظیر'' اور عبدالباری آسی کے مرتب کردہ ''کلیات نظیر اکبرآبادی'' کے مقدمے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس سلسلے میں حددرجہ معاون، مستند اور معتبر ہیں۔اس کے علاوہ بعض دوسری کتابیں بھی معاون و مددگار ثابت ہوئی ہیں۔نظیر کی زندگی کے مطالعے میں بھی ان کے تاریخی شعور کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

باب دوم کا عنوان ''نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی قسمیں'' ہے۔نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں عوام دوستی اور انسانی ہمدردی کے موضوعات پیش ہوئے ہیں۔اسی طرح بعض نظموں میں ہندوستانی لوک کلچر کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔بعض نظمیں وہ ہیں جن میں فطرت کی متنوع تصویریں پیش کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ ایسی منظومات بھی جابجا دیکھنے کومل جاتی ہیں جن میں نظیر کا صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ایسی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشی، سادگی اور رواداری، امن اور شانتی کے جذبات کے ساتھ ساتھ مذہبی رواداری اور جزا و سزا کے نکتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نظیر کے یہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں ہندو کلچر اور معتقدات کی ترجمانی کی گئی ہے۔اپنی نظموں میں نظیر ان موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن میں پند و نصیحت سے کام

لیا گیا ہے۔ ایسی نظموں میں خاص طور پر فکری اور فلسفیانہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ باب دوم ایک بھر پور باب ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''نظیر اکبر آبادی کی بعض نظموں کا پس منظر'' ہے۔ اس باب میں نظیر کی اہم اور چنندہ نظموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ نظیر کی نظموں کے پس منظر کو جاننے کے لئے ان کے عہد اور ماحول کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''تاریخی واقعات تک نظیر کی فنکارانہ رسائی'' ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس باب میں نظیر کے تاریخی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کس طرح نظیر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کے تاریخی واقعات کو اجاگر کیا ہے اور کس انداز سے اپنے عہد میں جیتے ہوئے تاریخی واقعات تک فنکارانہ رسائی دکھائی ہے، اس کا اپنی بساط بھر اس باب میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی طرح زیر نظر باب ''اختتامیہ'' ہے۔ اس باب میں گذشتہ چاروں ابواب کا نچوڑ یا ماحصل پیش کیا گیا ہے تا کہ ان چند صفحات کے مطالعہ سے کوئی بھی باذوق قاری پوری تحقیق کے مزاج و معیار کا اندازہ لگا سکے۔

سب سے آخر میں ان کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کتابوں سے میں نے تحقیق کے دوران استفادہ کیا ہے۔ اس فہرست میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جن کے مطالعے سے اس موضوع کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا۔

000

# کتابیات

◊

| شمار | کتاب | مصنف/مرتب | اشاعت |
|---|---|---|---|
| [۱] | کلیات نظیر اکبرآبادی | عبدالباری آسی | ۱۹۵۱ء |
| [۲] | زندگانی بے نظیر | عبدالغفور شہباز | ۱۹۵۱ء |
| [۳] | اردو ادب کی تنقیدی تاریخ | سید احتشام حسین | ۱۹۸۳ء |
| [۴] | تنویر ادب | صغیر احمد جان | ۱۹۸۰ء |
| [۵] | حرف ادب | شجاعت علی سندیلوی | ۱۹۷۸ء |
| [٦] | گلزار نظیر | سلیم جعفر | ۱۹۹۱ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| [۷] | تاریخ ادب اردو | وہاب اشرفی | ۲۰۰۷ء |
| [۸] | اردو ادب کی تاریخ | تبسم کاشمیری | ۲۰۰۶ء |
| [۹] | اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ | سلیم اختر | ۲۰۰۰ء |
| [۱۰] | ادب اور زندگی | مجنوں گورکھپوری | ۱۹۸۴ء |
| [۱۱] | سہ ماہی ''ادیب'' علی گڑھ | جلد۱۲، شمارہ۴ | ۱۹۸۸ء |
| [۱۲] | نظیر شناسی | اکبر علی بیگ/محمد علی اثر | ۱۹۸۷ء |
| [۱۳] | نظیر اکبر آبادی | علی احمد فاطمی | ۱۹۸۳ء |
| [۱۴] | حکایت ہند | تاراچرن | ۱۹۶۴ء |
| [۱۵] | تاریخ اہل ہند | ڈاکٹر تاراچند | ۱۹۶۱ء |
| [۱۶] | تاریخ ادب اردو (جلد سوم) | جمیل جالبی | ۲۰۰۶ء |
| [۱۷] | تاریخ ادب اردو (جلد دوم) | وہاب اشرفی | ۲۰۰۷ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| [۱۸] | نظیر نامہ | شمس الحق عثمانی | ۱۹۷۹ء |
| [۱۹] | اردو کی عوامی روایت چہار بیت کے حوالے سے | شکیل جہانگیری | ۱۹۹۸ء |
| [۲۰] | اتر پردیش کے لوک گیت | اظہر علی فاروقی | ۱۹۸۷ء |
| [۲۱] | اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو | یونس اگاسکر | ۱۹۷۸ء |
| [۲۲] | اردو میں لوک ادب | قمر رئیس | ۱۹۸۹ء |
| [۲۳] | نظیر اور انسان | مخمور اکبرآبادی | ۱۹۳۸ء |
| [۲۴] | نظیر: میری نظر میں | نیاز فتح پوری | ۱۹۴۰ء |
| [۲۵] | نظیر کی شاعری کی خصوصیات | جلال الدین جعفری | ۱۹۴۰ء |
| [۲۶] | نظیر اکبرآبادی اور مشترکہ کلچر | رشیدہ کوثر | ۱۹۹۸ء |
| [۲۷] | نظیر اکبرآبادی کی جمالیات | شکیل الرحمٰن | ۲۰۰۳ء |
| [۲۸] | نظیر اکبرآبادی | محمد حسن | ۱۹۹۴ء |
| [۲۹] | نظیر اکبرآبادی: بحیثیت عوامی شاعر | طاہرہ پروین | ۲۰۰۷ء |

[۳۰]  نظیر کی شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر  سید آل ظفر  ۲۰۰۸ء

[۳۱]  دیوانِ نظیر  فرحت اللہ بیگ  ۱۹۵۸ء

[۳۲]  روحِ نظیر  مخمور اکبرآبادی  ۱۹۸۸ء

000

**Foreword**



Barkat Ali
(Supervisor)
Dr. Barkat Ali
Head, Dept. of Urdu
M. L. S. M. College
Darbhanga

Md. Fahim Rabbani
(Researcher)

**4. Research coverage - theme and area**

The research work will cover all the available nazms of Nazir particularly in the light of "Kulliyat-e-Nazir Akbarabadi" compiled by Dr.Shujaat Ali Sandelwi. As the theme is to project the socio-political and cultural scenario of the age, the nazms based on the contemporary realities will be critically assessed to achieve the goal.

**5. Contribution of research work to the discipline of Urdu language and literature**

As the literature is a finer blend of history, this research work, when completed will throw the colourful light on the pages of history specially in the context of Agra- the capital of India during the period of Akbar. The expected colourful light of socio-plitico-cultural scenario may substantiate or contribute to the Medieval Indian history to some extent.

**6. Methodology to be adopted**

The required and relevant matter will be extracted from the nazms of Nazir and assessed in respect of the topic and content. Then they will be placed under the related chapters. The works will be basically subjective and primary sources will play a vital role in it.

**7. Work design (tentative plan of proposed research work**

To find out the desired result, the research work will be divided into the following four chapters:-

# Synopsis for Ph.D.degree in Urdu

**Name of researcher:** Md.Fahim Rabbani

**Name of supervisor:** Dr.Barkat Ali, MLSM College, DBG.

**1. Title of research work**

**A STUDY OF NAZIR AKBARABADI'S HISTORICAL NAZMS**

**2. Statement of the research problem**

Shaikh Md.Wali alias Nazir Akbar Abadi ( 1740-1830) was a stalwart of Urdu Nazms. Although, he composed magnificent Ghazals too, the history of Urdu literature has acclaimed his name and fame as a great Nazm writer. This is an established point that his contribution to Urdu Nazm is more valuable as well as unparallel.

Nazir touched a number of topics right from the Indian festivals to religions personalities. He was a great admirer of almost all the natural and social facts which reflect Indianess is his Nazms. His Nazms have been analysed from different angles but the nazms which depict the contemporary political, social, cultural and religious realities have not been assessed meaningfully uptill now.

Therefore, this research work will be contained to such nazms.

**2. Objective of research**

The main objective of this research work is to study Nazir's nazms which are based in historical facts of the age and project a socio-political and cultural scenario which emerges from within the nazms artistically.

# A STUDY OF NAZIR AKBARABADI'S HI STORICAL NAZMS

Thesis Submitted
for Ph. D.
in Urdu (2010)
L. N. MITHILA UNIVERSITY, KAMESHWARANAGAR
DARBHANGA

*Supervisor*
**Dr. Barkat Ali**
Head, Dept. of Urdu
M.L.S.M. College, Darbhanga
Bihar

*Scholar*
**Md. Fahim Rabbani**
At + P.O. : Mohiuddinpur Pakri
Via : Benipur, Darbhanga
Bihar